JUNE
2024

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اپنی بیگم محترمہ ڈاکٹر شگفتہ زکریا کے ساتھ

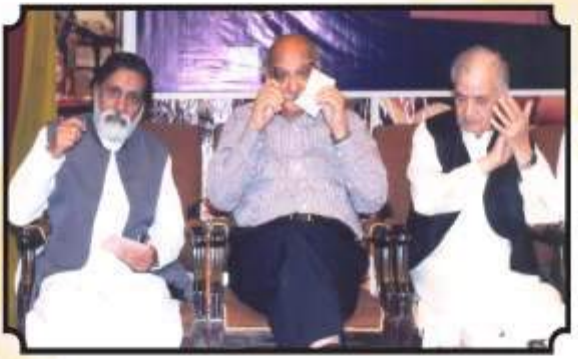

جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب امجد اسلام، جناب اعجاز رضوی (بیاض کی تقریب میں)

جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب اعجاز رضوی

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

بات ہم کب تک کریں گے بات کا رُخ دیکھ کر
اے ہوا یہ بادباں کس پل اتارے جائیں گے

زورِ سیلابِ انا ٹوٹے گا آخر کس گھڑی
ساحلوں کی سمت کب طوفاں ہمارے جائیں گے

موجِ خوں بن کر دلِ حساس سے اچھلیں گے کب؟
ہم درِ اظہار سے کس دن گزارے جائیں گے

زندگی کی دلدلوں میں زندگی دھنس جائے گی
شہر مٹی کے سمندر میں اسارے جائیں گے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36353300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شمارہ

ماہنامہ
بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - جون 2024 - شمارہ نمبر: 6

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور

A/c Title: Monthly BAYYAZ

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور - 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	جلیل عالی، خاور اعجاز، سرور حسین نقشبندی	7 تا 9
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، آرم ناصر، شوکت محمود شوکت، احمد جلیل رضا اللہ حیدر، افروز رضوی، صغیر احمد صغیر، اعجاز دانش نبیل احمد نبیل، سرور حسین نقشبندی	10 تا 20
3	عقیدت	مرزا آصف رسول	21
4	رباعیات	گلزار بخاری، محمد نصیر زندہ	22 تا 23
5	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	24 تا 27
		کچھ بنیادی معلومات	28 تا 31
6	گوشہ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	مضامین: عشرت سلطانہ، خواجہ محمد زکریا، جمیل احمد عدیل	32 تا 51
		خواجہ محمد زکریا مختصر آرا: احسان دانش، سلیم اختر: اجمل نیازی، بریگیڈیئر حامد سعید، سید محمد اکرم شاہ، اظہر جاوید، رحیم گل، ضیاء الحسن، مسز شگفتہ زکریا	52 تا 53
		شاعری: خواجہ محمد زکریا	54 تا 60
7	مضامین	بلقیس ریاض، حامد یزدانی، محمد نوید مرزا، ثمینہ سید، احسان فیصل کنجاہی، فیصل زمان چشتی، ثاقب تبسم ثاقب، منیر عباس سپرا، عمران میر، النصر منیر، فیصل عرفان	61 تا 101
8	رودادِ سفر	حسن یاسر ملک	102 تا 111
9	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	112 تا 120

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، انور شعور، نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی خاور اعجاز، راحت سرحدی، محمد انیس انصاری، گلزار بخاری سید افسر ساجد، اسلام عظمی، اجمل اعجاز، نثار ترابی، اکرم ناصر عقیل رحمانی، رضا اللہ حیدر، طالب انصاری، عظمیٰ جون، افروز رضوی، اقبال سروبہ، شوکت محمود شوکت، مسعود احمد میتھیو محسن، مظہر امام، شبہ طراز، طلعت شبیر، اعجاز دانش شہاب صفدر، محمد اشرف کمال، بشیر احمد حبیب، احمد جلیل ہمایوں پرویز شاہد، خالدہ انور، رخشندہ نوید، محمود کیفی، کوکی گل انصر حسن، ثمینہ سید، افتخار شوکت، اکرم جاذب، حسنین سحر خالد ندیم شانی، شاہین عباس، محمد شفیق انصاری، اکمل حنیف سعدیہ بشیر، وسیم جبران، محمد نوید مرزا، نبیل احمد نبیل علی حسین عابدی، فیض رسول فیضان، فرح شاہد، محمد اشفاق بیگ عطا العزیز، ریاض ندیم نیازی، سید تیمور کاظمی، انجم عثمان عبدالرؤف زین، ثقلین جعفری، عزیز عادل، ظہور چوہان اصغر علی بلوچ، شبیر نازش، محمد اویس قریشی، امتیاز انجم محمد کلیم، عابد رضا، عظمیٰ نقوی، محمد نور آسی، انصر منیر نائلہ راٹھور، زبیر خیالی، رخسانہ سحر، اورنگزیب حسام حر جیا قریشی، حنا بابر چوہدری، نوید صادق، کنور امتیاز احمد	121 تا 198
11	طنز و مزاح / خاکے	اعجاز رضوی، سیدہ آمنہ ریاض	199 تا 204
12	افسانے	آشا تھ کنول، محمد امین کنجاہی، نجم رضوی وقا یزدان منش، عاصم بخاری	205 تا 225
13	نظمیں	خالد احمد، سید افسر ساجد، صفدر صدیق رضی، خاور اعجاز گلزار بخاری، خالد علیم، شاہنواز زیدی، رخشندہ نوید شاہ محمد سبطین شاہجہانی، طلعت شبیر، امجد بابر، نائلہ راٹھور امر مہکی، عظمیٰ نقوی، شائستہ رمضان، اعجاز رضوی	226 تا 241

حمد

کس دل پہ وا حقیقتِ وحدت نہیں ہوئی
ہم سے ہی ترک رغبتِ کثرت نہیں ہوئی

کس اوج اُس کا طبلِ جلالت نہیں بجا
کس موج اُس کے نام کی نوبت نہیں ہوئی

دل کو گواہ کر کے یہ منکر بھی کہہ نہ پائیں
محسوس اُن کو اُس کی ضرورت نہیں ہوئی

آغاز اُس کا نام لیے بن کیا اگر
شامل کسی بھی کام میں برکت نہیں ہوئی

رکھا نہ ایسے شخص کو اُس نے کبھی عزیز
بندوں کے ساتھ جس کو محبت نہیں ہوئی

توصیف اُس کی ہو سکے کیسے رقم تمام
ارزاں کسی قلم کو یہ طاقت نہیں ہوئی

اعزازِ عرضِ حمد مقدّر کی بات ہے
عالی عطا یہ سب کو سعادت نہیں ہوئی

جلیل عالی

حمد

گزرتی جا رہی ہے آج تک جس کے سہارے پر
متاعِ زندگی قربان اُس کے اِک اشارے پر

مِٹا دیتا ہے جو نام و نشاں تک بھی سفینوں کے
وہی لاتا ہے میری ڈوبتی کشتی کنارے پر

اُسے معلوم ہے میری ضرورت بھی، طبیعت بھی
مجھے بہنا نہیں آیا کبھی دُنیا کے دھارے پر

مَیں اُس کی رائے کا بھی منتظر ہُوں کارِ ہستی میں
سو مَیں نے چھوڑ دی ہے بات ساری استخارے پر

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لبستی تک پہنچے ، جھرنا خوشبو کا
اے قادر ہادی ، اے غالب مولا

حمد

گدا کو سطوت شاہان کوئی دیتا ہے
برائے حمد سخن دان کوئی دیتا ہے

دکھا کہ اپنی ہی قدرت کا کوئی نقش حسیں
جمالِ فن کو نئی شان کوئی دیتا ہے

مرے وجود کی نس نس میں جلوہ گر ہو کر
خود اپنی ذات کا عرفان کوئی دیتا ہے

نظر خطاؤں کی شرمندگی سے اٹھتی نہیں
صدائیں تجھ کو پشیمان کوئی دیتا ہے

برائے حمد جو سر کو جھکا کے بیٹھتا ہوں
بنا کے مصرعۂ آسان کوئی دیتا ہے

مری دعا کا بھرم ٹوٹنے نہیں دیتا
ہمیشہ رکھنے کو حیران کوئی دیتا ہے

لگا کے لو مجھے اپنے ہی ذکر کی سرور
سرور و کیف کا سامان کوئی دیتا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

اُسؐ سایۂ جمال کا کیا کیا کرم رہا
دل بے نیازِ فکرِ وجود و عدم رہا

جھکنے کہیں دیا نہ اِس اوجِ نصیب نے
ہر پل در حضورؐ پہ سر اپنا خم رہا

دن رات اُسؐ کی دُھن میں رہیں دل کی دھڑکنیں
آنکھوں میں شکرِ نسبتِ عالی کا نم رہا

ہر پل رہی وہ صورت و سیرت نگاہ میں
بہرِ شعور نورِ بصیرت بہم رہا

تدبیر سرفراز ہوئی ہے جہاں جہاں
پیشِ نظر اُسؐ کا ہی نقشِ قدم رہا

سینے میں اُسؐ کے نام کی نوبت کا زیر و بم
آہنگِ گاہ گاہ نہیں دم بہ دم رہا

کیا کیا گہر پروئے گئے حرف و صوت کے
ہر ہار شانِ ہدیۂ مدحت سے کم رہا

خالی زر خلوص سے جَیبِ عمل رہی
بس اک اُسی کے نام سے اپنا بھرم رہا

عالی اُسی نگاہِ کرمؐ سے مرا قلم
ہر سرد و گرمِ دہر میں وقفِ حرم رہا

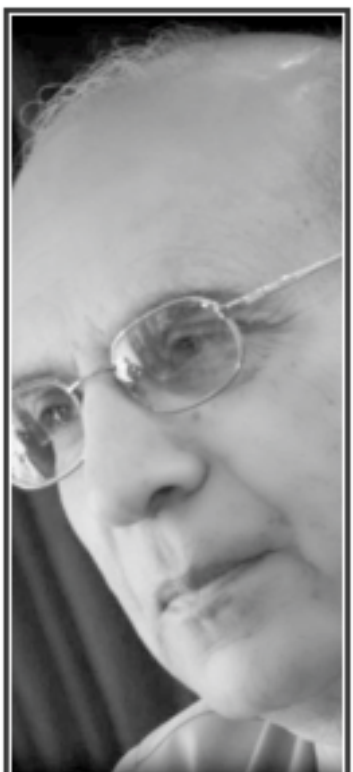

جلیل عالی

نعتؐ

آقاؐ سے جونہی ہوتا ہے منسوب تصوّر
ہو جاتا ہے پھر خوب سے کیا خوب تصوّر!

میں خود جو کبھی جا نہ سکوں، یہ بھی ہے ممکن
بن کر وہاں جائے مرا مندوب، تصوّر!

یہ مرتبہ ہوتا ہے عطا اُنؐ کے کرم سے
محبوبؐ سے بڑھ کر بنے محبوب تصوّر

اللہ کرے ایسی گھڑی آئے نہ ہرگز
طیبہ سے تو دُوری کا ہے ناخوب تصوّر

جب عُود کا مرغولہ مری سانس کو چھو لے
لگتا ہے کہ خوشبو کا ہے مکتوب تصور

بس ان کی طرف دھیان کیے بیٹھا رہوں میں
کچھ اَور کہاں ہے مجھے مطلوب تصوّر؟

نسیمِ سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مدح لکھوں میں کس کی خالد، کس کی حمد کروں
رحمت دو عالم ہیں، رحمت کل کے آئینہ دار

نعتؐ

فیصلے سارے محمد کا خدا کرتا ہے
ہاں مگر سچ ہے محمد کا کہا کرتا ہے

ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہو تو پھر
پوچھ کر میرا خدا ان کی رضا کرتا ہے

اس کے لب چومتے ہیں پیار سے اک دوسرے کو
جب کوئی نامِ محمد کو ادا کرتا ہے

ہے کوئی میرے محمد کے علاوہ بھی یہاں
چاروں جانب سے جسے صاف دکھا کرتا ہے

جھولی بھرتی ہے محمد کا حوالہ دے کر
جب کوئی ہاتھ اٹھاتا ہے دعا کرتا ہے

مجھ کو اک بار تم اس در سے لپٹ جانے تو دو
پھر میں دیکھوں گا کوئی کیسے جدا کرتا ہے

ہے کوئی ایسا سخی مجھ کو مدینہ لے جائے
ہاں یہی ایک صدا روز گدا کرتا ہے

ہاں سفارش ہو محمد کی تو پھر بات بنے
مانتا میں بھی ہوں وہ سب کی سنا کرتا ہے

پوری ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا جو بھی
واسطہ دے کے محمد کا دعا کرتا ہے

اکرم ناصر

نعتؐ

محمد مصطفےٰ کا جس نے ، سنگِ آستاں دیکھا
کھلی آنکھوں زمیں پر اس نے گل زار جناں دیکھا

مریضِ لا دوا جا کر، مدینے میں شفا پائیں
مدینے کی فضاؤں میں قرارِ قلب و جاں دیکھا

جدائی سبز گنبد سے گوارا تھی نہ زائر کو
کہ سیلِ اشک آنکھوں سے، دمِ فرقت رواں دیکھا

وفورِ شوق سے، فرطِ عقیدت سے، سوئے طیبہ
وفا کا قافلہ صدیوں سے ہر لمحے رواں دیکھا

مدینے میں جو پل گزریں ، وہی ہیں زیست کا حاصل
مدینے کے بنا جینا ، یقیناً رائگاں دیکھا

یہ اعجازِ جنونِ عشقِ طیبہ ہے کہ چاروں اور
مدینہ ہی نظر آیا، جدھر دیکھا، جہاں دیکھا

نبی سارے مکرم ہیں مگر عظمت جداگانہ
کوئی کون و مکاں دیکھے، کسی نے لامکاں دیکھا

صحابہؓ تو صحابہؓ تھے، جو حرزِ جان تھے سارے
عدوئے جان پر بھی آپؐ کو تو مہرباں دیکھا

گریزاں اس لیے ہم سے ہیں سب آلام دنیا کے
دورِ پاک ہی شوکت ، سدا ورِدِ زباں دیکھا

شوکت محمود شوکت

نعتؐ

جو سمجھ آتی نہ تھیں قرآں کی تحریریں مجھے
مل گئی ہیں سنتوں میں اُن کی تفسیریں مجھے

میں نے جب دل میں اُتارے اُن کے جلووں کے ہجوم
مہر و مہ کی ماند سی لگتی ہیں تنویریں مجھے

ایک مدت تک مری آنکھوں نے جو دیکھے تھے خواب
ڈھونڈ نے آئی ہیں اُن کی آج تعبیریں مجھے

دیکھتا رہتا تھا میں ہاتھوں کو اپنے رات دن
آج آئی ہیں سمجھ میں اُن کی تحریریں مجھے

جب سرِ محشر چلی اُن کی شفاعت کی ہوا
معتبر لگنے لگی ہیں اپنی تقصیریں مجھے

آج کملی والے کا آیا بلاوا جب جلیل
دیکھتی ہیں حیرتوں سے میری تقدیریں مجھے

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ان کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے ، کیا عجز اظہار
وہ جان جاں ، وہ آقا ، وہ دلبر، وہ دلدار

نعتؐ

سامنے طیبہ ہو اعجاز نظر ایسا ہو
یہ بھی ممکن ہے کرم اُن کا اگر ایسا ہو

جس میں ہر گام پہ انوارِ الٰہی برسیں
سب ہی کہتے ہیں اگر ہو تو سفر ایسا ہو

ہم نے دیکھا ہے مدینے کے حسیں منظر کو
ہم کو منظور ہے گر خلد میں گھر ایسا ہو

باغ جنت کی حسیں صبح کا دیدار کریں
یہ نظارہ بھی مدینے کی سحر ایسا ہو

الوداع طیبہ کو ہر بار کہیں روتے ہوئے
یہ جدائی بڑی مشکل ہے مگر ایسا ہو

حشر میں ان کی شفاعت کی نویدیں پائیں
حبِ سرکار دو عالم کا ثمر ایسا ہو

ہر کٹھن موڑ پہ رحمت کا ہو سایہ مجھ پر
میری پر سوز دعاؤں کا اثر ایسا ہو

گلشنِ طیبہ کی خوشبو سے مہکتا ہی رہے
دل رضا ایسا ہو سینہ ہو جگر ایسا ہو

رضا اللہ حیدر

نعتؐ

نور پھیلا ہر طرف اور بول بالا ہو گیا
آپ آئے تو زمانے میں اجالا ہو گیا

چاند نازاں اپنی قسمت پر ہوا ہے کس قدر
واقعہ شق القمر جس کا حوالہ ہو گیا

گر پڑے لات ومنات آتش کدے سب بجھ گئے
آپ کی آمد سے عالم میں اُجالا ہو گیا

خوش ہیں سب جن و بشر، شمس وقمر بھی شاد ہیں
''بارہویں کے چاند کا ہر سو اجالا ہو گیا''

مٹ گئی ہیں اب جہاں سے جہل کی تاریکیاں
گوشہ گوشہ اس جہاں کا نور والا ہو گیا

ہیں دیوانے آپ کے جن و بشر حور و ملک
ہر کوئی شاہِ امم کا چاہنے والا ہو گیا

میں سرِ قرطاس لکھوں آپ کی توصیف کیا
ہے کرم افروز پر جو شاہ والا ہو گیا

افروز رضوی

نعتؐ

بے سر و سامان کا ساماں مکمل ہو گیا
میں چلا طیبہ مرا ایماں مکمل ہو گیا

دیکھنے والا تھا منظر جب کہا جبریل نے
اے مرے ختمِ رسل قرآں مکمل ہو گیا

جانتے ہیں لوگ مجھ کو بھی ثناء خوانِ نبی
دل میں جو ارمان تھا ، ارماں مکمل ہو گیا

چاند سورج، بحر و بر یوں آپ کے تابع ہوئے
جنبشِ ابرو ہوئی فرماں مکمل ہو گیا

اے نویدِ ابنِ مریم اے تمنائے خلیل
تجھ پہ آ کے رب کا ہر احساں مکمل ہو گیا

کون مومن کون کافر، کون کس کے ساتھ ہے
کربلا میں آ کے یہ عرفاں مکمل ہو گیا

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک خوشبو سے مہک رہے ہیں آئینہ خانے
زینہ زینہ، نس نس اُتری ، چاہت کی مہکار

نعتؐ

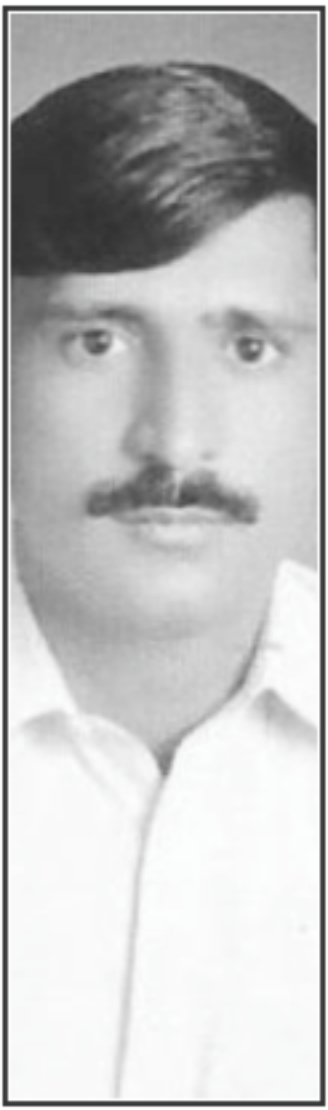

میں آج حمد و مناجات لے کے آیا ہوں
محبتوں سے بھری نعت لے کے آیا ہوں

میں کیوں نہ ناز کروں اپنی خوش نصیبی پر
درِ حضورؐ سے خیرات لے کے آیا ہوں

شعور و آگہی آداب و خلق جن سے ملا
انہی سے سیرتِ سادات لے کے آیا ہوں

میں جانتا ہوں ستاروں سے گفتگو کا ہنر
میں ان سے علمِ سماوات لے کے آیا ہوں

میں در پہ آیا ہوں آقا عمل نہیں ہے کوئی
یہ چند اشکوں کی سوغات لے کے آیا ہوں

ہو اب تو لطف و عنایت کی اک نظر آقاؐ
غمِ حیات کے دن رات لے کے آیا ہوں

خدایا اذنِ حضوری مجھے بھی مل جائے
لبوں پہ حرفِ مناجات لے کے آیا ہوں

یہ لکھنا پڑھنا سنانا یونہی نہیں دانش
بیاضِ حمد و ثنا ساتھ لے کے آیا ہوں

اعجاز دانش

نعتؐ

خواہشِ دید لیے شام و سحر دیکھتا ہوں
جانبِ طیبہ اُٹھی اپنی نظر دیکھتا ہوں

جشنِ میلاد مناتا ہوں میں جب بھی گھر میں
رقص کرتی ہوئی آنگن میں سحر دیکھتا ہوں

شوقِ دیدار کبھی کم نہیں پڑتا میرا
دیکھتا ہوں میں اُدھر بارِ دِگر دیکھتا ہوں

اُنؐ کی یادوں میں جو بہتے ہیں سرِ شام طلب
اپنے اشکوں کو میں پاکیزہ گہر دیکھتا ہوں

جانبِ طیبہ میں پھر عزمِ سفر باندھتا ہوں
پہلے میں غور سے سب عیب و ہنر دیکھتا ہوں

سبزہ و گل کہ بچھے جاتے ہیں اشکوں میں مرے
اور قدم لیتے ہوئے اپنے، شجر دیکھتا ہوں

نعت کہنے کا شرف جب سے ملا ہے مجھ کو
اوجِ افلاک پہ میں اپنا ہنر دیکھتا ہوں

گھیر لیتی ہے مجھے جب کبھی اُفتاد کوئی
اُنؐ کو دیتا ہوں صدا جانبِ در دیکھتا ہوں

مل بھی سکتا ہے کبھی اِذنِ زیارت مجھ کو
جانبِ شہرِ نبیؐ آٹھوں پہر دیکھتا ہوں

جب بھی اُنؐ کے کرم و لُطف میں آتا ہوں نبیلؔ
اُنؐ کا گھر دیکھتا ہوں، جنبشِ دَر دیکھتا ہوں

نبیل احمد نبیلؔ

نعتؐ

ہو لاکھ خلقِ خدا سے آگے
نہیں کوئی مصطفےٰ سے آگے

کہاں بلندی کی دسترس ہے
حضور کے نقشِ پا سے آگے

مرے نبی کے قدم لگے ہیں
حدودِ ارض و سما سے آگے

میں شہرِ طیبہ کو چل پڑا ہوں
مرا قدم ہے ہوا سے آگے

عروجِ انساں کی روشنی ہے
خطاب کوہِ صفا سے آگے

سفر کیا ہے مرے نبی نے
عروج کی انتہا سے آگے

درود بھیجا جو اول آخر
قبولیت ہے دعا سے آگے

زمانے بھر کا کوئی بھی موسم
نہیں حرم کی فضا سے آگے

وہ دیکھ باب کرم کھلا ہے
خیالِ مدح و ثنا سے آگے

نہیں کوئی صنفِ شعر گوئی
ثنائے خیر الوریٰ سے آگے

زمانہ پیچھے رہے گا اس کے
ہوا جو ان کی عطا سے آگے

کوئی سکندر جہان بھر کا
نہیں ہے ان کے گدا سے آگے

درود کا اہتمام رکھو
دعا سے پہلے دعا سے آگے

خدا کی بندوں سے گفتگو ہے
سکوت غار حرا سے آگے

سخی بڑے سے بڑا نہیں ہے
نبی کے دست غنا سے آگے

سجی تھی صلِ علیٰ کی مسند
صدائے قالوا بلیٰ سے آگے

کسی کو ہرگز نہ لا کے رکھو
وقار آلِ عبا سے آگے

ہمیشہ دیکھا یہ میں نے سرور
عطا کھڑی تھی خطا سے آگے

سرور حسین نقشبندی

تصورِ طیبہ

عطا ہو اذنِ شہِ بحر و بر مدینے میں
مری بھی بات بنے حرفِ زر مدینے میں

خدا کے جس بھی جہاں میں مَیں جاؤں لوٹ آؤں
کہ میری روح کا، دل کا ہے گھر مدینے میں

زہے تصورِ طیبہ، خوشا خیال نبی
میں کاش یونہی رہوں عمر بھر مدینے میں

میں جاؤں طیبہ سے بطحا کو، آؤں پھر طیبہ
کہ گھر خدا کا ہے مکہ میں، در مدینے میں

حریمِ حسنِ ازل کا نیاز جو بھی ہو
ہیں لطف اور بہت عشق پر مدینے میں

وجودِ امتِ مرحوم کیوں بکھر جائے؟
بہم جو آ کے ہوں سب دل، نظر مدینے میں

ہزار بار فدا اُس پہ قُم بِاذنِی اللہ
وہ زندگی جو ہوئی زندہ تر مدینے میں

سمجھتا کون انا خاتم النبیین آج؟
نہ ملتی علم کو برہان اگر مدینے میں

ہیں گم رُسل سبھی جس لا نبی بعدی میں
وہ ضو ہے تا بہ ابد جلوہ گر مدینے میں

تھی راہِ غلبۂ دیں گو ہزاروں سال کی راہ
سفر تمام ہوا ہے مگر مدینے میں

ہیں نوریانِ فلک بھی درود خواں جس کے
زمیں نے دیکھی وہ شانِ بشر مدینے میں

ہے مستقیم صراطِ عبادت اور آصف!
ہمیں ملا ہے وقارِ سفر مدینے میں

مرزا آصف رسول

رباعیات

تنقید کے منصب سے سبکدوش رہو
بہتر ہے یہی وقت سے روپوش رہو
شاہی کے رموز تخت والے جانیں
تم گوشہ نشینوں میں ہو خاموش رہو

.....

اک فاحشہ میں شیخ نے دیکھی مستی
بولا کہ جنوں خیز ہے تیری پستی
عورت نے کہا جو ہوں نظر آتی ہوں
کیا آپ کی ہستی بھی ہے ایسی ہستی

.....

حد چاہے خطا میں نہیں چھوڑی باز آ
عصیاں کی طرف زندگی موڑی باز آ
رحمت کا یہ در، در نہیں مایوسی کا
سو بار بھی توبہ ہو جو توڑی باز آ

.....

میں روز ازل سے ہوا الستی یارب
منکر نہیں تیری مری ہستی یارب
مٹی میں ملائے مرے اسباب حیات
خاکم بدہن کیا کہیں مستی یارب

.....

وابستہ ہیں بھٹکی ہوئی اقلیم کے ساتھ
خواہش ہے کہ مذکور ہو تعزیم کے ساتھ
فرعون کے پیرو بھی دعا مانگتے ہیں
ہو خاتمہ بالخیر براہیم کے ساتھ

.....

فن اور ہنر میرا کشادہ کر دے
عرفانِ الٰہی مرا زیادہ کر دے
یا رب تیری ہستی ہے علیم اور خبیر
یا رب تو میرا علم زیادہ کر دے

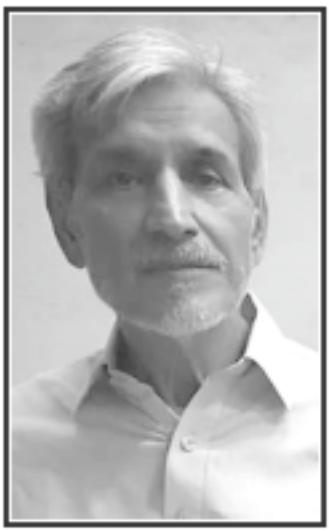

گلزار بخاری

رباعیات

خط کوئی نیا عرصہء تقدیر میں کھینچ
افلاک کی گردشوں کو زنجیر میں کھینچ
سورج ہوں تیری رقص گاہوں سے طلوع
نقش ایسا کوئی دیدۂ تصویر میں کھینچ

.....

ڈھل جاتے ہیں سنگ بھی گہر کی صورت
ہے ایک یہ بھی دست ہنر کی صورت
اوروں کے لئے دھوپ میں جلتے رہنا
ہوتے ہیں کچھ آدمی شجر کی صورت

.....

اپنی اوقات سے الجھ بیٹھا ہوں
ایسے حالات سے الجھ بیٹھا ہوں
میرا خوں صبح کی شفق میں ہو گا
میں ظلم کی رات سے الجھ بیٹھا ہوں

.....

منظر سے ہے چشم بینا رنگ برنگ
رنگ مے سے ہے مینا رنگ برنگ
اس کے رخ زیبا سے برستے ہیں رنگ
اس سے ہے رخ آئینہ رنگ برنگ

.....

کیا حسن بے مثال پہنا ہوا ہے
گلشن نے مرا جمال پہنا ہوا ہے
اس کی خوشبو سے میری سوچ اگتی ہے
یہ گل نے مرا خیال پہنا ہوا ہے

عینک سے حسیں دکھائی دیتا ہے جو
کنکر ہے نگیں دکھائی دیتا ہے جو
منظر یہ مری چشم فسوں گر کا ہے
ہوتا وہ نہیں دکھائی دیتا ہے جو

.....

وحشت پہ قبائے زیست تنگ ایسی تھی
دشت اوڑھ لیا میں نے امنگ ایسی تھی
وہ حشر کا رن پڑا میاں من و تو
سر کاٹ دیا اپنا یہ جنگ ایسی تھی

.....

یہ پردۂ حسن راست گاری ہے میاں
لیلائے بصیرت کی عماری ہے میاں
دانا کبھی گرتے نہیں دیکھے اس سے
یہ تجربہ عقل کی سواری ہے میاں

محمد نصیر زندہ

دل صفائیاں

میری الٹرا ساؤنڈ مشین پچھلے کئی روز سے خراب تھی نہ ہی اس کے پرنٹر سے مریضوں کی ٹھیک طرح سے تصویر نکلتی نہ ہی اس کی تشخیص واضح ہوتی بعض اوقات تو مریض کے سامنے ہی اسکرین پر اندھیرا چھا جاتا اس صورت میں اک تو مجھے پریشانی ہوتی دوسری بات یہ کہ مریض کو بھی تشویش ہوتی۔ بہت سے ٹیکنیشن بلائے مگر مشین کو افاقہ نہ ہوا اک روز اک نابغہ روزگار مستری کو بلایا، ,,ڈاکٹر صاحب اس مشین میں کوئی خرابی نہیں مستری نے فیصلہ صادر فرما دیا۔

,,تو پھر یہ ٹھیک طرح سے چلتی کیوں نہیں ،، میں نے پوچھا۔

,,صرف اس کی صفائی کی ضرورت ہے،، مستری نے تجربہ کار آنکھوں سے دیکھا تو اس نے علاج بھی بتا دیا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر ایک ملنے والے جو میرے محلے ہی کے باسی ہیں مگر صاحب دل ہیں کہنے لگے ۔

,,جیسے الٹرا ساؤنڈ مشین کی صفائی ضروری ہے دل بھی اک مشین ہے اس کی بھی صفائی ضروری ہے تھوڑی دیر بعد مستری پھر آدھمکا، ,,سر آکر مشین چیک کریں بالکل ٹھیک ہے،، اس نے تفاخر سے کہا میں نے کچھ مریضوں کا اس مشین پر چیک اَپ کیا۔ حیرت کی بات وہ بالکل درست ہو چکی تھی

دل کی درستگی بھی دل صفائیاں ہوں تو ہو گی اس کے اندر تنے ہوئے خواہشات کے جالے اتارنا ہوں گے اس کے اندر بے ایمانی کے بہتے دریائے نیل روکنا ہوں گے۔

دل کی غذا کیا ہے؟ محبت سے اللہ کا ذکر اللہ کے دھیان کے ساتھ اس کی یاد کہ جب سبحان اللہ کہیں تو دل میں محبوب کی شان ہو بڑائی ہو کبریائی ہو دل ہر لحہ کہے

,,اے میرے پیارے مالک میری کوئی شان و شوکت ہے ہی نہیں سب کی سب اور ساری کی ساری شان مالک ہی کی ہے سب بلندیاں تیرے لئے میں پستیوں میں گرا تیرا

سلیمان عبداللہ ڈار

بندہ تیرا طالب تیرا اپنا تیرا شاہکار ہوں اپنے شاہکار کو ضایع نہ ہونے دے اسے در بدر ہونے سے بچالے۔اک شاعر دوست جناب سعود عثمانی کا مصرع کیا خوب ہے:

سب در بدری ایک ٹھکانے کے لئے ہے

.....

ٹھکانہ مل گیا تو وارے نیارے نہ ملا تو کبھی اس کنارے کبھی اس کنارے سارے کے سارے گو کہ ہوں راج دلارے مگر بھٹکنا مقدر ہوگا دل صفائیاں ہوگی تو منزل ملے گی ورنہ در بدری ہوگی بلکہ باقی اعضا کی بھی صفائیاں ضروری ہیں جیسے زبان کی غذا بڑے اشتہا انگیز کھانے کان کی غذا سریلی آواز آنکھوں کی غذا حسین منظر ہیں اگر دنیاوی نظر سے بھی دنیاوی محبوب کو۔ کو دیکھیں تو اس میں بہت سے عیب ہیں وقت کے ساتھ ساتھ چہرے کی رعنائی صناعی مانند پڑ جائے گی رخسار جواب دھلکتے ہیں چند سال بعد جھریوں کے نرغے میں ہوں گے آنکھوں کی بصارت اور ذہن کی دل کی بصیرت روبہ زوال ہوگی تو پھر دل ایسے محبوب کے حوالے کر دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ میں سائنس کا طالب علم تو ہوں ہی جوانی میڈیسن، سرجری، فزیالوجی اور اناٹومی پڑھتے گزری ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ زحل مشتری زہرہ اور مریخ وغیرہ جیسے سیاروں میں بعض کو اللہ تین یا چار چاند عطا کیے ان میں سے ایک سیارہ عطارد ہے جسے ایک بھی چاند عطا نہ ہوا کیونکہ یہ سورج کے بہت قریب ہے وہاں ہر وقت روشنی رہتی ہے اس لئے وہاں چاند کی ضرورت ہی نہیں حاجت ہی نہیں طلب ہی نہیں یا دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں جو محبت کے آفتاب حق کے آفتاب کے ہم نشیں ہوں وہ حسن کے کسی عارضی وقتی نمائشی چاند کے نہ ہی طلب گار ہوتے ہیں نہ ہی انھیں ایسے چاند کی ضرورت ہوتی ہے انھیں تاج وتخت کا لالچ بھی نہیں ہوتا دنیا فانی کی ان کے ہاں کوئی قدر ہوتی ہے نہ ہی وقعت نہ حیثیت اور نہ ہی کوئی قیمت کہ سب سے قیمتی ذات سے ہی جب دل مل گیا تو دنیا کی فانی چیزوں کو دل میں جگہ دینا فضول ہے اور پاؤں کی دھول ببول کے برابر ہے جسے اللہ کا قرب مل گیا اس کے لیے باقی سب قدر اور محبت کے لائق ہی نہیں دل صفائیاں کب ہوگی کیسے ہوں گی؟ تنہائی میں اپنے اللہ کے سامنے اتارو نا ہوگا کہ میری یہ خطا مالک کی عطا میں بدل جائے رونے والے کو دل سفائی کا پتہ کیسے چلے گا جب دل سے دعا ہو گی ندامت ہوگی رونا ہوگا آئندہ کے لیے توبہ پر استقامت کا وعدہ ہوگا تو دل میں ٹھنڈک سی محسوس ہوگی سارا وجود گلابوں کی طرح ہلکا پھلکا محسوس ہوگا یہی دل کے صاف ہو جانے کی علامت ہے اک انجانا سا سکون جسم و جان کے اندر آتا محسوس ہوگا اک اک پل اللہ کی چاہت والے نشے میں

گذرے گا بندے کے دل سے تکبر نکل جائے گا اپنا آپ سے کم تر لگنے لگے گا چھوٹائی سیکھنے کو جی چاہے گا۔ بدترین دشمن سے بھی معافی مانگنا آسان نظر آئے گا اور معاف کرنا بھی مشکل نہیں لگے گا دل سے حسد دور ہو جائے گا پھر ہر دم اللہ کی تسبیح آسان لگے گی حمد کا بیان آسان لگے گا دنیا کی ودٹ اور نوٹ کی پلاٹ اور پرمٹ کی بات کرنا مشکل اور ناپسند ہوگا۔

کتنی عجیب بات ہے ہم کی آلودگی کے بارے میں پریشان ہوتے ہیں اس سلسلے میں محکمے بناتے ہیں وزارتیں قائم کرتے ہیں ماحول کی آلودگی کے بارے میں پارلیمانی سیکریٹری اور قائمہ کمیٹیاں اسمبلی میں بنتی ہیں حالانکہ اس سے کہیں زیادہ اہم دل کی آلودگی ہے اس کے بارے میں کوئی محکمہ کیوں نہیں بنتا بہت پڑھ لکھ جانے والوں کو بھی اس کی کوئی خبر نہیں کہ کسی یونیورسٹی کسی کالج یا سکول میں نہ ہی یہ مضمون پڑھایا جاتا ہے نہ ہی اس کے لئے کوئی پیپر آتا ہے نہ امتحان ہوتا ہے اگر اس مضمون میں سے 100 میں سے 33 نمبر لے کر بھی طلبا پاس ہو جاتے تو وطن عزیز سے کھربوں روپے کا کالا دھن بڑے بڑے سیاستدان اور بیوروکریٹ لے کر بیرون ملک نہ بھاگتے دل صفائیاں بندہ تو بناتی ہیں یہ قوم بھی بناتی ہیں مسلم امہ کا شاندار اور تابناک ماضی دل صفائیوں ہی کی وجہ سے روشن بھی ہے اور مثالی بھی کہ ایسی کوئی مثال کوئی بھی فرد یا قوم آج تک پیش نہ کر سکی

دل صاف ہو گیا اس کا کاٹھ کباڑ نکل گیا تو شکر واجب ہے کس کا؟ بیت اللہ والے کا کیونکہ صرف عبادت کرنے والے بیت اللہ شریف کا دیدار کرنے جاتے ہیں مگر دل صفائیاں والے گھر کا دیدار بھی کرتے ہیں اور گھر والے سے بھی تعلق جوڑتے ہیں لوگوں کو گھر کا دیدار ملتا ہے انھیں گھر والا ملتا ہے اور جب ملتا ہے تو وہ دعا گو رہتے ہیں کہ گھر والا کبھی جدا نہ ہو کہ جدائی سے بڑا کوئی عذاب نہیں اس بات کی صرف چاہنے والوں کو ہی سمجھ آسکتی ہے دوسروں کو نہیں۔

جیسے چہرے کی صفائی ہو تزئین و آرائش ہو فیشل ہو یا میک اپ کے لیے لوگ بیوٹی پارلر جاتے ہیں اس طرح دل صفائی کے لیے دل پر فاونڈیشن کریم لگانے اور تعلق والے پاؤڈر سے دل کی زیبائش کرنے والے اللہ کے سچے دوستوں کی محفل میں جاتے ہیں کہ یہ محفلیں روحانی بیوٹی پارلر ہیں لوگ بیوٹی پارلر میں چہرہ دھوتے ہیں وضو بھی تو دل صفائی کے لیے ایک ایسا ہی عمل ہے جس کے بعد بندہ خالق کے حضور سج دھج کے قیام کرتا ہے رکوع کرتا ہے جھکتا ہے جبین نیاز اس کے قدموں میں رکھ کر (گو کہ وہ تجسیم سے پاک ہے) مگر نیت کی حد تک وہ اپنا آپ اور اپنی چھوٹائی مالک کے حضور پیش کرتا ہے اس روحانی بیوٹی پارلر میں شکل نین نقش رنگ نسل لباس پوشاک چال ڈھال نہیں دیکھی جاتی محبت دیکھی جاتی

ہے خلوص دیکھا جاتا ہے ایمان دیکھا جاتا ہے
یقین دیکھا جاتا ہے عموماً صرف اندر ہی نہیں
بنتا بلکہ باہر کی بھی آرائش ہوتی رہتی ہے۔
اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا:
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

.....

بعض لکھاری قرطاس و قلم سے رشتہ استوار کرتے ہیں تو یہ مقصد سامنے ہوتا ہے کہ قلم اور کاغذ یا کاغذ سے قلم پر جو اترا محفوظ ہو جائے نسلوں کے کام آئے دل صفائی والے لکھاری اس کے خلاف مقاصد رکھتے ہیں۔ انکا دل دل کی تہہ سے کہتا ہے:

☆ یا اللہ ان کالموں سے ان الفاظ سے دل کو محبت کا درد عظیم عطا کر۔
☆ اے اللہ اس وجہ سے اپنی نسبت عطا کر۔
☆ قارئین ان الفاظ کو پڑھ کر جو دعائیں مانگیں گے ان میں کالم نگار کو بھی حصہ بنا۔
☆ ان الفاظ کی حلاوت عظمیٰ عطا کر۔
☆ ان کالموں کی وجہ سے دل صاف کر کے تقویٰ عطا کر۔
☆ عظیم محبت والی عظیم راسخ کیفیات عطا کر پھر ان پر استقامت عطا کر۔
☆ اے اللہ میرا کوئی استحقاق نہیں بس تو دان کر دے کہ سخی مالک ہے مانگت کو بن مانگے عطا کرنے والا ہے۔
☆ اے اللہ ان کاغذوں کو بال پوائنٹس کو پوائنٹر زکو ان الفاظ کو میرے لیے صدقہ جاریہ بنا دے آخرت کے لیے ذخیرہ کر دے۔
☆ یا اللہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لکھنے والا محروم جائے کہ وہ پڑھنے والوں سے زیادہ محتاج ہے۔
☆ اے مالک جو بھی لکھا پڑھا سنا بولا یا بتایا وہ تیری خوشی کے لیے ہے تیری خوشی ہی کے لیے تھا اگر اس میں کوئی نام و نمود کی خواہش تھی بھی تو اس ریاکاری اور دکھلاوے کو معاف کر دے۔

میرے مولا ہمیں مشہور ہو کر کیا کرنا ہے ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے تیرے نام پر مٹے ہیں ہمیں کیا غرض نشاں سے خاک میں ملا کر ہماری بھی خاک اُڑا دے کہ صلے اور ستائش کی تمنا بے کار ہوتی ہے اور سچے چاہنے والے ایسی تمناؤں سے دور رہتے ہیں۔

☆ اے اللہ سالک اور تیرا طالب ظاہری حسن کو خاطر میں نہیں لاتا مجھے بھی ایسا بنا دے کہ صرف تیرے تعلق کی خواہش ہو تیرے ملن کی آس ہو پاس ہو تو اپنا سالک اپنا طالب بنا دے سیم و زر کی تمنا سے بے نیاز کر دے نیریمولی پلازے اور مارکیٹیں کارز پلاٹ اور پرمٹ کیا کرنے تیری محبت کے تجھ سے وچھوڑے کے درد غم کے پلازے جو مشاق کے دلوں میں بنائے جاتے ہیں وہی کافی ہیں شافی ہیں کہ انہی کی وجہ سے لغزش قابل معافی ہیں ------

☆☆☆☆☆

کچھ بنیادی معلومات

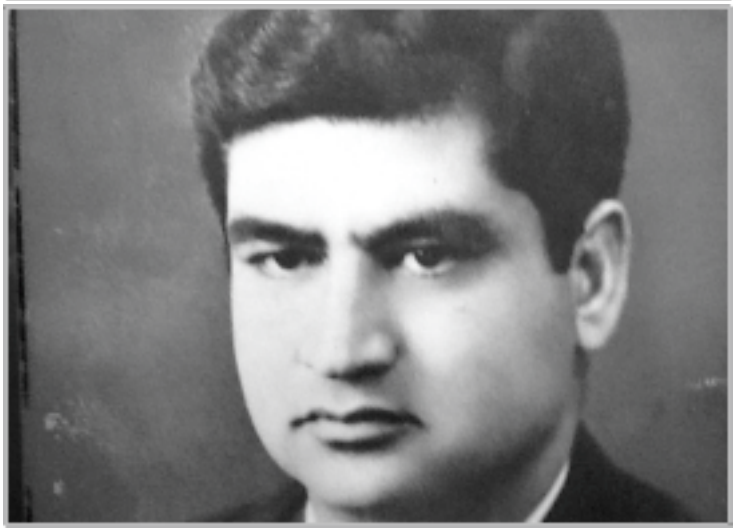

شخصی کوائف:

نام:	خواجہ محمد زکریا
تاریخ ولادت:	23 مارچ 1940 (امرتسر)
ولدیت:	خواجہ غلام نبی
مستقل پتا:	21/295 اے، طفیل روڈ، لاہور چھاؤنی

تعلیمی کوائف:

1-بی اے آنرز (فارسی)	گورنمنٹ کالج، لاہور	1960
2-ایم اے اردو (فسٹ کلاس فسٹ)	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	1962
3-ڈپلوما ہندی (فسٹ کلاس فسٹ)	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	1973
4-پی ایچ ڈی	پنجاب یونیورسٹی، لاہور	1974

تدریسی خدمات:

1- لیکچرار	گورنمنٹ کالج، لاہور	1962-63
2-لیکچرار	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	1963-70
3-اسسٹنٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	1970-77
4-ایسوسی ایٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	1977-79

5- پروفیسر	ملتان یونیورسٹی، ملتان	کیم فروری 79ء تا دسمبر 1970
6- ایسوسی ایٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	1980-83
7- پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	1983-2000
8- ماہر مضمون	پیکنگ یونیورسٹی، چین	1992
9- ماہر مضمون	جاپان	1995 تا 1999
10- پروفیسر ایمریٹس (اردو)	پنجاب یونیورسٹی، لاہور	2008 تا حال

انتظامی عہدے

1- پرنسپل	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	1995

پی ایچ ڈی کے مقالات کی نگرانی

پنجاب یونیورسٹی:

اردو:

	سند یافتہ کا نام	موضوع	ڈگری ملنے کا سال
1-	انور محمود خالد	اردو نثر میں سیرت رسول	1982

کتابیں:

1- قدیم اصناف شعر.....لاہور اکیڈمی، لاہور 1968
2- نئے پرانے خیالات.....ایضاً 1968
3- اردو میں قطعہ نگاری.....نیب بک ڈپو، لاہور، 1977
4- اکبر الہ آبادی۔ تحقیقی و تنقید مطالعہ.....مجلس ترقی ادب، لاہور 1980
5- کلیاتِ مجید امجد (زمانی ترتیب).....ماورا پبلشرز، لاہور 1968
6- Urdu for Beginners.....مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1991
7- روشنی کی جستجو (علاء الدین کلیم کا غیر مطبوعہ کلام).....عمیر پبلشرز، لاہور 1996
8- اقبالیات۔ چند نئی جہات.....خزینہ علم و ادب، لاہور 2001
9- تفہیم بالِ جبریل.....بزم اقبال، لاہور 2002
10- کلیاتِ حفیظ جالندھری (مقدمہ، ترتیب تحقیق).....الحمد پبلی کیشنز، لاہور 2005
11- انتخاب زریں اردو شاعری.....مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، 2019
12- افتاد (شعری مجموعہ)، 2018
13- آشوب (شعری مجموعہ).....الحمد پبلشرز، لاہور 2011
14- تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (چھ جلدیں).....پنجاب یونیورسٹی، لاہور 2009 تا 2015
15- کلیاتِ عدم (ترتیب و تدوین) الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2009
16- کلیاتِ داغ (ترتیب و تدوین) الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2011
17- نظر نامہ (محمود نظامی) تصحیح متن و حواشی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2012

18- مختصر تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور 2016

19- کلیات حالی 2018

20- کلیات اکبر الہ آبادی 2022

21- افکار و گفتار، پنجاب یونیورسٹی 2021

مطبوعہ مقالات / مضامین:

1- جوش کی نظم نگاری	ماہنامہ ساقی، کراچی، (جوش نمبر)	1963
2- ڈاکٹر محمد صادق کی "تاریخ ادب اردو" (انگریزی) کا تجزیہ	ماہنامہ "کتاب" لاہور	1967
3- اقبال کا فلسفہ خودی (محمد عثمان) کا جائزہ	ایضاً	1967
4- حالی اور شیفتہ	مجلہ "کریسنٹ" اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور (حالی نمبر)	1969
5- سید عابد علی عابد کی تصنیفات و تالیفات	ماہنامہ "تحقیق" لاہور	1971
6- اکبر اور اقبال	مجلہ "راوی" گورنمنٹ کالج، لاہور	1973
7- مجید امجد _ کچھ یادیں کچھ باتیں	"قند" پشاور (مجید امجد نمبر)	1974
8- رسالہ "قند" کے مجید امجد نمبر کا جائزہ	سہ ماہی "فنون" لاہور	1974
9- مجید امجد _ وفات پر تاثرات	سہ ماہی "اوراق" لاہور	1978
10- خاک نشین (میرزا ادیب) کا مطالعہ	مجلہ "نقوش" لاہور	1978
11- حفیظ جالندھری کی غزل	سہ ماہی "صحیفہ" لاہور	جنوری 1972
12- حفیظ جالندھری کی شاعری اور یہ سرزمین	شمولہ کتاب "ابوالاثر پیر اثر" (مرتبہ بیگم خورشید حفیظ) لاہور	1977
13- اقبال اور قاآنی	"یادنامہ اقبال _ ایران کلچرل سنٹر، لاہور	1977
14- اکبر الہ آبادی سے منسوب ایک جعلی کتاب (گنج پنہاں)	ماہنامہ "کتاب" لاہور	1977
15- اقبال معاصرین کی نظر میں (از عبداللہ قریشی)	سہ ماہی "صحیفہ" لاہور	نومبر 1977
16- علاءالدین کلیم (شخصی خاکہ)	مجلہ "معاصر" لاہور	1980
17- مجید امجد کا تصور کائنات	ماہنامہ "ماہ نو" لاہور	مئی 1981
18- سید عبدالحمید عدم	ماہنامہ "ماہ نو" لاہور	مئی 1981
19- سید جعفر طاہر (شخصی خاکہ)	مجلہ "تحقیقی ادب" کراچی	1982
20- حافظ محمود شیرانی اور مجموعہ نغز	ایضاً	ستمبر 1982
21- "محبی" از محمد طفیل	مجلہ "نقوش" لاہور	ستمبر 1982
22- اکبر الہ آبادی اور ہمارا قومی تشخص	ماہنامہ "ماہ نو" لاہور	اگست 1983
23- ڈاکٹر سید عبداللہ _ ادبی خدمات	مجلہ "سیارہ" لاہور	1986
24- نقوش کا غزل نمبر	مجلہ "نقوش" لاہور	1987
25- جھنگ کا قلندر	پاکستانی ادب، اسلام آباد	1990
26- فصاحت جنگ جلیل	سالنامہ "نقوش" لاہور	1991-92
27- جدید اردو نظم اور فیض	ماہنامہ "علامت" لاہور	اگست 1993

28- مجید امجد کی شاعری	مجلّہ "القلم" جھنگ (مجید امجد نمبر)	1994
29- کلامِ اقبال میں خود احتسابی تلقین	سہ ماہی "اقبال" لاہور	جنوری 1995
30- اردو نظم کے پچاس سال	مجلّہ "سیارہ" لاہور	1997
31- فکرِ اقبال کی تسہیل	سہ ماہی "اقبال" لاہور	جولائی 2000
32- ن۔م راشد کا فکری ارتقا	مجلّہ "راوی" گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور	2000
33- پہلی بارش اور ناصر کاظمی	مجلّہ "خیال" فیصل آباد	2001
34- اشفاق احمد کا ناول کھیل تماشا	مجلّہ "راوی" گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور	2002
35- تاریخِ ادب اردو (ڈاکٹر محمد صادق)	در کتاب "اردو کے لیے خدمات" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	2003
36- پاکستان میں جدید اردو نظم	ماہنامہ "جمناحت" ہریانہ (بھارت)	2003
37- ایوب صابر ایک اقبال دوست محقق و نقاد	اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	
38- نعیمہ ضیاالدین کے افسانے	مجلّہ "مغزن" 17، بریڈ فورڈ، انگلینڈ	2005
39- حمید احمد خاں..... ایک کثیر الجہت شخصیت	ماہنامہ "الحمرا" لاہور	مارچ 2006
40- 1947 کے بعد اردو نظم	مجلّہ "سیارہ" لاہور (شمارہ 54)	2006
41- شاد عارفی_ ایک تعارف	ایضاً	مئی 2006
42- وحید الہ آبادی_ ایک تعارف	ایضاً	جون 2006
43- علامہ اقبال اور ہمارے مسائل (ا)	ایضاً	نومبر 2006
44- مرزا ہادی رسوا کی شاعری	ایضاً	فروری 2006
45- حمید احمد خاں_ اکبر معتبر غالب شناس	مجلّہ "حریم ادب" بوریوالہ	اگست 2007
46- اقبال اور مجید امجد	مجلّہ "الحمرا" لاہور	نومبر 2007
47- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار_ ادبی خدمات	سہ ماہی "اقبال" لاہور	جنوری 2008
48- حفیظ تائب_ ایک عظیم نعت گو	ماہنامہ "ماہِ نو" لاہور	اپریل 2008
49- ڈاکٹر وحید قریشی_ ایک دیو پیکر شخصیت	ماہنامہ "الحمرا" لاہور	دسمبر 2009
50- ڈاکٹر وزیر آغا	ماہنامہ "کاغذی پیرہن" لاہور	اپریل 2011
51- ن۔م راشد کی نظم ابو لہب کی شادی	"الحمرا" لاہور	جنوری 2011
52- مولانا حالی اردو شاعری	صحیفہ لاہور حالی نمبر	جنوری 2015
53- بچھڑ گئے	الحمرا لاہور	2020
54- غالب زندہ و پائندہ	تخلیق لاہور	2020

میرے بارے میں:

1- پاکستانی ادب کے معمار، اکادمی ادبیات، امجد طفیل، 2022

2- خواجہ محمد زکریا حیات و فن، عشرت سلطانہ 2023

☆☆☆☆☆

حالات زندگی

خاندان: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے آباؤ اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق قوم ''صراف'' سے ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے تایا زاد بھائی خواجہ غفور احمد کے مکتوب کے حوالے سے لکھا ہے:

''ہمارے آباؤ اجداد کشمیر کے ایک گاؤں کے رہائشی تھے جسے فتح گڑھ کہتے تھے، اس لیے یہ ''فتح گڑھیے صراف'' کہلائے۔ بہت کم صراف مشرف بہ اسلام ہوئے..... صراف Non Agriculturist ذات یا گوت ہے۔ صراف عربی زبان کا لفظ ہے جسے انگریزی میں Money Changers کہتے ہیں۔ یہ لفظ ستار کا مترادف نہیں ہے ہمارے یعنی آپ کے اور میرے پردادا اور ان کے بھائی جو پشمینہ شالوں اور دُھسوں کا کاروبار کرتے تھے، امرتسر آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ دکان کٹرہ آہلو والیاں میں تھی۔ جہاں سب ہندو دکاندار تھے..... امرتسر کے ایک معمر کشمیری کمشنر (لالہ متو) نے مجھے ایک دفعہ کہا تھا کہ بھئی تمھارے بزرگ بہت بڑے تاجر اور اصحاب ثروت تھے۔ میں نے ان کا کاروبار دیکھا تھا۔ ہمارے پردادا اور ان کے بھائی کے نام تھے خواجہ عزیز اللہ صراف اور خواجہ ربیع اللہ صراف۔ اول الذکر ہمارے آپ کے پردادا تھے۔ ان بھائیوں کا کاروبار امرتسر اور کلکتے میں تھا۔ یہ خاندان امرتسر کے چوک پراگداس کے علاقے میں رہائش پزیر تھا۔ ایک بڑی حویلی کے علاوہ کافی مکانوں کے مالک تھے۔ غالباً اڑوس پڑوس کے گھروں کے مالک ہوں گے۔ وہیں ایک گلی کا نام ''کوچہ عزیز بی بی'' تھا یہ ہماری پردادی تھیں۔ معلوم نہیں کب کاروبار تباہ ہوا اور کب اور کیوں جائیدادیں ہاتھوں سے نکلیں۔''

خواجہ محمد زکریا کے دادا خواجہ غلام محی الدین (مرحوم) اردو فارسی عربی تینوں زبانیں جانتے تھے اور ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ کشمیر ہاؤس کے نامی گرامی ''دیوانی وکیل'' کے منشی مقرر ہوئے اور تادم مرگ رہے۔ خواجہ صاحب کے تایا زاد بھائی مختار احمد ناز بہت اچھے شاعر تھے۔ خواجہ زکریا کی شعری تربیت میں ان کی بیاضوں کا بڑا حصہ ہے۔ دو تین بیاضوں میں ان کا اپنا کلام تھا مگر ایک بیاض میں مختلف شاعروں کا کلام سے منتخب چیزیں درج کی گئی تھیں۔

عشرت سلطانہ

''اقبال اور اختر شیرانی کے نام پہلی دفعہ انہی بیاضوں سے معلوم ہوئے اور کچھ کلام بھی نظر سے گزرا۔''

پیدائش: میٹرک کی سند میں خواجہ صاحب کی تاریخ ولادت 23 مارچ 1940 درج ہے۔ خواجہ محمد زکریا اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''میں امرتسر کے گنجان آباد محلے میں ان دنوں پیدا ہوا جب دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ میری ابتدائی یادوں میں ایک چھوٹا سا گھر، بہن، بھائی، والدین اور بلیک آؤٹ شامل ہیں۔ کبھی کبھی طیارہ اڑتا ہوا گزر جاتا تو کنبے کے افراد جنگ کے بارے میں گفتگو کرنے لگتے۔''

تعلیم: خواجہ محمد زکریا کی تعلیمی زندگی کا آغاز امرتسر میں ہوا۔ انھیں ایم بی پرائمری سکول اندرون سلطان ونڈ گیٹ میں داخل کرایا گیا جو جلیانوالہ باغ کے قریب تھا۔ اس کی عمارت نئی اور خوبصورت تھی لیکن ماسٹر صاحب کے ظالمانہ رویے کی وجہ سے خواجہ صاحب کا وہاں دل نہ لگا۔

''میں غالباً چار سال میں تیسری جماعت تک پہنچا تھا۔ 1946 میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا اور مارچ 1947 میں امتحان پاس کر کے چوتھی جماعت میں جانا تھا کہ امرتسر میں ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔''

خواجہ صاحب کی تیسری جماعت کے دوران ہی قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا۔ وہ اپنے خاندان کے ہمراہ پہلے لاہور آئے دو تین مہینے بعد والدین نے جھنگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ خواجہ محمد زکریا نے 1947 میں گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں چوتھی جماعت میں داخلہ لیا۔ پانچویں جماعت میں اسلامیہ سکول جھنگ صدر میں داخل ہوئے۔ 1949 میں پانچویں کا امتحان پاس کیا اور وہیں سے 1954 میں میٹرک کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخل ہو گئے والدین کے اصرار پر انھوں نے پری میڈیکل مضامین رکھ لیے۔ چونکہ سائنس ان پر زبردستی مسلط کر دی گئی تھی، اس لیے خواجہ محمد زکریا نے اس جانب توجہ نہ دی اور انٹرمیڈیٹ کے دو سال کرکٹ کھیلنے اور شعر کہنے میں صرف کر دیئے۔

پھر افراد خانہ کی رضا سے خواجہ صاحب نے آئندہ پسند کے مضامین پڑھے مگر اپنے مشاغل کو بھی جاری رکھا۔ چونکہ مضامین ان کی پسند کے تھے اس لیے ان کے مشاغل سے ان کی تعلیمی کارکردگی پر اثر نہ پڑا اور 1958 میں آپ نے یہ امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور لاہور جانے کی ضد شروع کر دی۔ ابتدا میں تو آپ کو والدین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ کی استقامت کی بدولت آپ کو اجازت مل گئی۔

''انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرتے ہی میں جھنگ سے بیزار ہو گیا اور میں نے اعلان کر دیا

کہ اب میں فقط اپنی مرضی کے ادارے میں تعلیم حاصل کروں گا اور وہ ادارہ گورنمنٹ کالج، لاہور ہے۔ میری ضد کے آگے والدین سپر انداز ہو گئے اور میں لاہور پہنچ کر گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گیا۔ یہ 1958 کی بات ہے۔ پھر لاہور تھا اور نصابات، اور شاعری، ادبی حلقے اور سیر و تفریح مگر چونکہ مضامین میری پسند کے تھے اس لیے میں ہمیشہ لائق طلبا میں شمار ہوتا تھا۔''

1960 میں خواجہ محمد زکریا نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد والدین کے اصرار پر گورنمنٹ کالج میں ایم اے انگریزی کے لیے ٹیسٹ دیا۔ جن چند امیدواروں نے امتحان پاس کیا، ان میں خواجہ محمد زکریا بھی شامل تھے۔ تاہم انھوں نے اورینٹل کالج میں ایم اے اردو میں داخلہ لینے کو ترجیح دی۔ ایم اے کا تحقیقی مقالہ ''اردو میں قطع نگاری'' ڈاکٹر وحید قریشی کے نگرانی میں تحریر کیا۔ اورینٹل کالج سے خواجہ محمد زکریا نے 1962 میں ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے 700 میں سے 435 نمبر لے کر ریکارڈ قائم اور یونیورسٹی گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1973 میں اورینٹل کالج سے ہندی زبان میں دو سالہ ڈپلومہ حاصل کیا۔ 1974 میں اکبر الہ آبادی پر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی نگرانی میں مقالہ قلم بند کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ملازمت: ستمبر 1962 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار ہو گئے۔ اس کے ایک سال بعد اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں سلیکشن ہو گئی۔

"Lecturer in Urdu September 1962 G.C Lahore- Resigned in May 1963 becasue he was offered the appointment in Urdu Department in University Oriental collage Lahore."

خواجہ محمد زکریا کی 1970 میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پر ترقی ہوئی۔ آپ کے بہتر کام کی وجہ سے 1977 میں آپ کی مزید ترقی ہو گئی اور ایسوسی ایٹ پروفیسر کے فرائض انجام دینے لگے۔ 1979 میں پروفیسر کی حیثیت سے ملتان یونیورسٹی میں منتخب ہوئے، جس کا نام اب بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان ہو گیا ہے۔ وہاں آپ صدر شعبہ اردو اور دین آف فیکلٹی رہے۔ وہاں سے ایک سال بعد استعفیٰ دے کر پنجاب یونیورسٹی میں واپس آ گئے۔ 1983 میں پروفیسر ہو گئے۔ 1984 میں صدر شعبہ کے طور پر تقرر ہو گیا۔ 1974 سے 1979 کے درمیانی عرصہ میں آپ تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے پنجاب یونیورسٹی شعبہ ہندی سے وابستہ رہے۔ آپ نے شعبۂ کشمیریات میں بھی تدریس کی۔ 1980 میں خواجہ صاحب نے سول سروسز اکیڈمی میں بھی ایک سال دفتری اردو پڑھائی۔

یکم فروری 1992 میں خواجہ زکریا کا تقرر چین کی پیکنگ یونیورسٹی میں ہوگیا جہاں آپ نے گیارہ ماہ اردو کے ماہر مضمون کی حیثیت سے کام کیا۔ یکم جنوری 1993 وطن واپس آئے۔ 1993، 1994 اور 1995 میں کچھ عرصہ پنجاب یونیورسٹی میں ڈین آف فیکلٹی اور پرنسپل اورینٹل کالج رہے۔ 1995 میں آپ کو جاپان سے اردو پڑھانے کی پیشکش ہوئی چنانچہ آپ چار سال کی طویل رخصت لے کر جاپان کے ادارے جائیکا (Jaica) سے وابستہ گئے۔ 1999 میں واپس آگئے اور اپنے سابقہ عہدے پر خدمات سرانجام دینے لگے۔ 22 مارچ 2000 میں آپ سرکاری ملازم سے ریٹائرمنٹ کے بعد ستمبر 2001 سے فروری 2004 تک ایچی سن کالج اردو Coordinator کے طور پر بھی منسلک رہے۔ فروری 2004 میں دونوں سے استعفیٰ دے دیا۔ جولائی 2008 سے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند میں بطور ڈائریکٹر تحقیقی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ چار جلدیں مکمل کر چکے ہیں پانچویں جلد پر کام ہو رہا ہے۔ (بعد میں چھ جلدیں مکمل ہوئیں)

شادی: خواجہ محمد زکریا 1968 میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے ان دنوں وہ اورینٹل کالج میں پڑھا رہے تھے۔ آپ کی شریک حیات شگفتہ حیات نے بھی اورینٹل کالج سے 1986 میں ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ بیگم شگفتہ زکریا نے بعد ازاں پی ایچ ڈی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے 1992 میں حاصل کی۔ لاہور کالج برائے خواتین کی صدر شعبہ اردو رہیں، پھر لاہور کالج یونیورسٹی میں ڈین آف اورینٹل فیکلٹی کی حیثیت سے کام کیا۔ 2006 میں ریٹائرڈ ہوئیں۔

اولاد: خواجہ زکریا کے تین بچے ہیں، دو بیٹے، ایک بیٹی۔

سب سے بڑے بیٹے کا نام فواد زکریا ہے، تاریخ ولادت 6 اکتوبر 1959 ہے انھوں نے ایم بی اے فلاڈیلفیا امریکہ سے کیا۔ آج کل امریکہ کیلیفورنیا میں ایک جرمن کمپنی کے چیئرمین ہیں۔

جواد زکریا 5 اکتوبر 1972 کو پیدا ہوئے۔ ایم بی اے روچسٹر امریکہ سے کیا۔ آج کل اسلام آباد Jazz میں منیجر ہیں۔

صباہت زکریا 24 فروری 1978 کو پیدا ہوئیں۔ ایم اے انگریزی کنیئرڈ کالج سے کیا۔ آج کل ایچی سن کالج میں استاد ہیں۔ (اب نیوجرسی امریکہ میں ہیں)

''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی'' کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد خواجہ محمد زکریا کو اُن کی جگہ مقرر کیا گیا۔ ہر شخص نے اس بات کی تعریف کی کہ اب یہ بہترین ادارہ ہو جائے گا۔ 2010 میں انھیں ''پروفیسر امریطس'' بنا دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

زندگی ایک اور سَو افتاد

طالب العلمی کے زمانے میں میری اولین خواہش یہ تھی کہ میں آئندہ زندگی میں بطور شاعر جانا جاؤں۔ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے چند برسوں میں اگر کالج کے طلبہ مجھ سے واقف تھے تو میری شعر گوئی کی وجہ سے۔ ایم اے اُردو کے دوران میری توجہ ادھر نہ رہی اور قریباً چالیس سال شاعری ترک کیے رکھی۔ اس طویل وقفے کے بعد دوبارہ اس طرف مائل ہوا تو میری شاعری آشوب حالات کی عکاسی کرنے لگی۔ 2012 میں پہلا شعری مجموعہ ''آشوب'' شائع ہوا تو اس کی پزیرائی میری توقع سے بڑھ کر ہوئی اور اس کے بارے میں بہت سے تاثراتی اور تنقیدی مضامین میری فرمائش کے بغیر لکھے گئے۔ ظاہر ہے کہ میں خوش ہوا۔ میری پچھترویں سال گرہ کے موقع پر ان مضامین کو یکجا کر کے انھیں ایک دلچسپ دیباچے کے ساتھ میری جیون ساتھی شگفتہ نے ''خواجہ محمد زکریا کی شاعری_ نقد و نظر'' کے زیرِ عنوان چھپوا دیا۔ چونکہ میں نے باردگر شاعری شروع کر دی تھی اور خاطر خواہ حوصلہ افزائی بھی ہو رہی تھی اس لیے یہ سلسلہ رکا نہیں اور اب بھی جاری ہے چنانچہ ''آشوب'' کے بعد کی شاعری جمع کر کے دوسرا مجموعہ ''افتاد'' کے نام سے تیار کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اہم شاعر تخلیقِ شعر میں کل وقتی دلچسپی رکھتے ہیں۔ میرے جیسے لوگ جو تدریس، تنقید، تحقیق اور دیگر ذاتی و غیر ذاتی مصروفیات میں بٹے رہتے ہیں، محض جز وقتی شاعر بن سکتے ہیں۔ میری شاعری دراصل انخلائے جذبات (Catharsis) کی کوشش ہے جس کا سبب ذاتی دکھ درد نہیں ہیں۔ الحمدللہ تقدیر نے مجھے پُرسکون ذاتی زندگی عطا کی ہے اور کبھی کوئی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اسی لیے تو میں یہ شعر کہہ سکا:

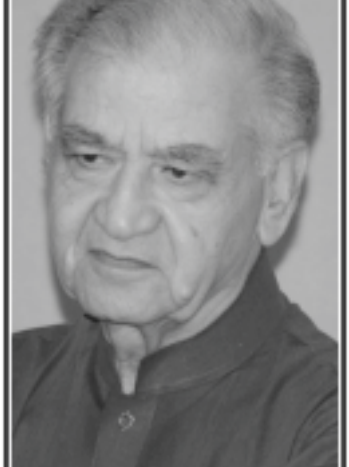

خواجہ محمد زکریا

جائے حیرت ہے کہ شکوہ نہ کوئی دل نے کیا
رات جب عمرِ گزشتہ پہ نظر کی میں نے

.....

لیکن مجھے پاکستان کے ابتر حالات نے بہت رنج دیا ہے۔
میں نے قیام پاکستان کی تحریک کا آخری زمانہ دیکھا ہے - ہندوؤں کی چھوت چھات، کوشش کے باوجود فراموش نہیں کر سکا اور نہ ہی اس قتل و غارت کو بھول سکا ہوں جو امرتسر میں چھ ماہ جاری رہا۔ 1945-46 کے الیکشن بھی خوب یاد ہیں جب بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اور سرکنڈوں پر سبز جھنڈیاں لگا کر بھی جلوسوں میں ''لے کے رہیں گے پاکستان'' اور ''بٹ کے رہے گا ہندوستان'' کے نعرے لگایا کرتا تھا۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد مساوات، امن اور انصاف کے دور کا آغاز ہو جائے گا۔ بہت سی اونچ نیچ کے باوجود پہلے دس برسوں میں پاکستان کی ترقی مناسب انداز میں ہو رہی تھی مگر پھر 1958 میں ایک سپہ سالار نے مارشل لاء لگا دیا۔ بظاہر ترقی کی رفتار تیز ہو گئی مگر اُن دس برسوں میں زوال کی بنیاد بھی ڈال دی گئی۔ صدارتی نظام کا نفاذ ہوا اور بنگالیوں کو شدت سے احساس ہوا کہ انھیں حکومت میں شرکت سے محروم کر دیا گیا ہے۔
1965 کی جنگ کے جو بھی ذمہ دار تھے انھوں نے شاطری سے یا خلوص سے آئندہ کے زوال کا راستہ ہموار کیا۔ 1971 میں ایک اور جنگ ہوئی اور ملک دولخت ہو گیا۔ ذمہ دار کون تھا؟

اور اب.....اپنے اپنے خیالوں میں
چلنے لگی ہیں کروڑوں جبڑوں، ٹھوتھنیوں میں زبانیں
جبھیں بجھی ہوئی بے مصرف قیلوں قالوں میں
(مجید امجد)

پھر ایک نام نہاد جمہوریت، پھر اور ایک طویل مارشل لاء اور پھر نئی جمہوریتوں کی دو دو باریاں، پھر ایک اور مارشل لاء..... پھر ایک اور جمہوری قائد کی تیسری باری پھر بے تحاشا لوٹ مار کر کے سرمایہ باہر منتقل کرنے والے حکمرانوں کی عیاریاں غرض 1958 سے 2018 تک (ساٹھ سال) تدریجی زوال کا ایک لامختتم دور ہے، جس سے باہر نکلنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا - آمریت اور جمہوریت دونوں نے سارے نظام کو ایک دوسرے سے بڑھ کر بگاڑا ہے۔ ان حالات میں تحریکِ پاکستان کا بے لوث زمانہ دیکھنے والا ایک آٹھ سالہ لڑکا، موجودہ حالات سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتا ہے جب اسے ہر طرف بگاڑ ہی بگاڑ دکھائی دیتا ہے!
جب یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں تو فضا اتنی گرد آلود ہے کہ کسی طرف کوئی راستہ بجھائی نہیں دیتا۔ تمام ادارے تباہ ہو گئے ہیں۔ نوکر شاہی کا یہ نشہ ہے کہ ہر جگہ سینئر لوگوں پر جونیئر لوگ مسلط ہیں کیونکہ وہ حکمرانوں کے مفادات کی بہتر نگہداشت کر سکتے ہیں۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی جائز کام فائل کو پہیے لگائے بغیر ہو جائے۔ پانی، بجلی، گیس اور دیگر گھریلو ضروریات کی چیزیں ''راشن'' پر ملتی ہیں۔ چند سڑکوں اور پلوں کو چھوڑ کر کرتوڑ پھوڑ، گندگی، اور آلودگی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بے روزگاری کا عفریت بے قابو ہے۔ غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزارنے والوں کو باقاعدہ مزدوری بھی نہیں ملتی۔ بہت سے لوگوں کا مقدر فاقہ کشی ہے۔ بیماریاں عام ہیں۔ ہسپتالوں میں مخلوقِ خدا روتی رہتی ہے مگر کوئی مداوا نہیں۔ قتل و غارت، چوریاں اور ڈاکے، غیرت کے نام پر بے دریغ خون بہانا، کم سن بچوں اور بچیوں پر جنسی تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات، پولیس اور انصاف دینے والے اداروں کا انتہائی ظالمانہ رویہ، قرض لے کر اُسے بے دریغ ضائع کرنا اور اقساط کی ادائیگی کے لیے مزید قرض لینا، طرح طرح سے لوٹ کھسوٹ کر کے سرمائے کو بیرونِ ملک منتقل کرتے رہنا۔ سب کچھ کھلم کھلا ہو رہا ہے۔

اور اب تعلیمی ابتری کا ذکر ہو جائے۔ بے شمار دیہات سکولوں سے محروم، سکول عمارتوں سے محروم، عمارتیں استادوں سے محروم۔ کالج اور یونیورسٹیاں ایسے سند یافتہ افراد پیدا کر رہی ہیں جن کی بہت بڑی تعداد اپنے مضامین کی ابجد سے بھی ناواقف ہے۔ صبح امتحان ہو تو دانش بُور رات کو رٹا لگاتے ہیں یا ''بُوٹیاں'' کرتے ہیں اور پھر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ طب ہو یا ہندسہ تربیت کا معیار پست۔ سائنس، معاشرتی علوم اور ادبیات کی بیشتر اعلیٰ ترین ڈگریوں کے حامل افراد محض نقل در نقل کا سہارا لیتے ہیں اور کسی اپج سے عاری ہیں۔ تعلیمی اداروں کے لیے پالیسی ساز افراد ''اُوخویشتن گم است کرا رہبری کند'' کی مجسم تصویر ہیں وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اپنی شاعری میں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اور جہاں تک شعری پابندیوں میں محصور رہ کر کر سکا ہوں، انھی حالات کی جزوی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں بہت معمولی شخص ہوں لیکن جب تک میں ملازمت میں تھا، اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس وجہ سے اور بھی زیادہ ناآسودہ رہتا ہوں اور اب جب کہ اپنے جیسے چند باقی ماندہ افراد کی طرح تیزی سے زندگی کی اننگز کے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ زندگی رائیگاں چلی گئی ہے۔ میری شاعری اسی رائیگانی کا نوحہ ہے۔ پاکستان میں جو لوگ اس عرصے میں اقتدار کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر لوگوں کے کھیتوں کو بے دریغ روندتے چلے گئے ہیں۔ میں نے اسی ظالمانہ ''کھیل'' کی عکاسی کی ہے اور اسی کے خلاف احتجاج کیا ہے۔

ممکن ہے یہ مزاحمت کا ایک روپ ہو۔ ہو سکتا ہے بعض جگہ محض تصویر کشی ہو۔ بہر حال میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے اسے دیانت داری سے بے رورعایت قلمبند کر دیا ہے۔ کئی جگہ بعض اہلِ اقتدار کے نام بھی آ گئے ہیں اور بہت سے نام رہ بھی گئے ہیں لیکن ان کو بھی اس فہرست میں شامل سمجھئے اور ناموں کو علامتی سمجھئے جو اپنے جیسے دوسرے ناموں کی نمائندگی کرتے ہیں:

شیخ و سیّد سے تو خالی نہیں ذکر شاعر
ذات سے ان کی مخاطب نہیں فکرِ شاعر
اکبرالہ آبادی

اگرچہ اس مجموعے میں حالات حاضرہ کی عکاسی گہرے رنگوں میں کی گئی ہے لیکن یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ موضوعات یہی کچھ ہیں۔ میں کبھی جوان بھی تھا اس لیے کہیں کہیں جوانی یاد آ گئی ہے اور بقول سعدی ''درعنفوانِ جوانی چناں کہ افتد و دانی''۔ فلسفیانہ اور مابعدالطبیعاتی مسائل نے بھی ہمیشہ مجھے بے کل رکھا ہے۔ خصوصاً زندگی کی بے مقصدیت کا مجھے شدید احساس ہے۔ جبر و قدر کے مسائل بھی پریشان کرتے رہتے ہیں جنھیں فلسفہ سلجھا سکا ہے اور نہ سائنس بلکہ Stephen Hawking کی سائنسی جبریت نے مجھے پہلے سے زیادہ الجھا دیا ہے۔ اس کے باوجود میں اعلیٰ اقدار اور اخلاقیات کا بہت قائل ہوں۔ افسوس اس کی تفصیل میں یہاں مہیا نہیں کر سکتا میں اس بات پر عامل ہوں کہ ہر کسی کو اپنے اپنے قائد مبارک ہوں:

کفر کافر را و دیں دیں دار را
ذرّۂ دردے دلِ عطار را

.....

میرے نزدیک شاعری کی کوئی بندھی ٹکی تعریف ایسی نہیں جس پر سب متفق ہو سکیں اصطلاحات کی تعریفیں مبتدیوں کے لیے ہوتی ہیں اہلِ علم ان سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ شاعری کے ہزار روپ بہروپ ہیں۔ اردو شاعری کی گزشتہ تین سو سالہ تاریخ میں میر، سودا، درد، نظر اکبرآبادی، انشاء انیس، غالب، داغ، حالی، اکبرالہ آبادی، اقبال، یگانہ چنگیزی، فراق، جوش، حفیظ جالندھری، ن م راشد، فیض، میراجی، مجید امجد اور منیر نیازی وغیرہ ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں! پھر بھی سب کے سب کسی نہ کسی حوالے سے اہم شعرا ہیں۔ کیا شاعری کی کوئی ایسی جامع و مانع تعریف وضع کی جاسکتی ہے جس کا اطلاق ان سب کی شاعری پر ہو جائے؟ چنانچہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے آپ شاعری کا نام دیں یا نہ دیں، آپ کی مرضی ہے۔ بے شک اسے کلام منظوم و مقفّیٰ کہہ لیں یا آزاد نظموں کو محض کلامِ منظوم قرار دیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اب نقادوں کی میڑھی ترچھی تنقیدوں سے بیزار ہو چکا ہوں اور یہ

بھی حقیقت یہ ہے کہ ادبی ذوق بہت حد تک داخلی اور موضوعی چیز ہے اس لیے یہ شاعری جیسی بھی ہے کم از کم میرے دل سے نکلی ہے:

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

.....

اس میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو میرے قارئین کی اس Readability کو مانتے ہیں- دوسرے لفظوں میں یہ کہ اسے سہولت سے پڑھا جاسکتا ہے میری ذہنی تربیت میں کلاسیکی شاعری کا بہت دخل ہے لیکن میں نے اس کی نقالی نہیں کی بلکہ حسبِ ضرورت کلاسیکی نظم وضبط سے انحراف بھی کیا ہے-

میری شاعری کا سب سے بڑا حربہ طنز ہے- اکبر الہ آبادی کی شاعری کا میں زبردست مداح ہوں- ان کے ہاں شدتِ جذبات کے ساتھ زورِ تخیل بھی موجود ہے اس لیے ان کے ہاں طنز میں مزاح کی تناسب آمیزش ہے- میری قوتِ تخیل مقابلتاً بہت کمزور ہے اس لیے مجبوراً میں نے زیادہ تر طنز سے کام لیا ہے تاہم اکبر سے متاثر ہونے کے باوجود میں نے موضوعات کا دائرہ اپنے عصری مسائل تک پھیلانے کی کوشش کی ہے- سادگیِ بیان اور تلقینِ اقدار کا طرز میں نے حالی سے سیکھا ہے جن کی شاعری آرائش سے مبرا ہے - یگانہ چنگیزی سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ ایک ہی لفظ حسبِ ضرورت شاعرانہ اور غیر شاعرانہ ہوسکتا ہے- میں نے اردو، فارسی، پنجابی اور انگریزی شاعری سے ممکنہ حد تک استفادہ کیا ہے اور یہ اثرات میری شاعری میں آسکے ہیں یا نہیں اس کے بارے میں پڑھنے والے بہتر رائے دے سکتے ہیں- میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے دو پسندیدہ شعرا یعنی اقبال اور مجید امجد سے اپنی شاعری سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے تاہم نادانستگی میں ان کا پرتو پڑ گیا ہو تو ''معذور دار مارا-''

میں اپنے وسیع مطالعہ محترم دوست اور منفرد آرٹسٹ ''ریاظ'' کا دل کی گہرائیوں سے سپاس گزار ہوں جنھوں نے میرے بعض اشعار کو منقش کر کے انھیں پُر لطف بنایا اور کتاب کی سادگی میں تزئین کے عنصر کا اضافہ کیا- دوسرا شکریہ واجب ہے صفدر حسین صاحب کا جو الحمد پبلی کیشنز جیسے موقر ادارے کے مالک ہیں- ان کی اور میری دوستی کی عمر تیس سال کے قریب ہے- وہ اس لحاظ سے میرے محسن ہیں کہ جب مجھ پر کاہلی غالب آجاتی ہے اور تصنیف و تالیف سے دور ہو جاتا ہوں تو ان کا اصرار مجھے پھر سے کسی کتاب کی تیاری پر آمادہ کر دیتا ہے- میری کتابیں انھی کے اصرار پر تکمیل پزیر ہوئیں اور منظرِ عام پر آئیں- یہی سبب ''افتاد'' کی اشاعت کا ہے-

☆☆☆☆☆

کلام اقبال میں خود احتسابی کی تلقین

اقبال کی نظم ونثر کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے ملّتِ اسلامیہ کے دین ودنیا کو سنوارنا اور پھر ملّتِ اسلامیہ کے توسط سے دنیا بھر کی اقوام و ملک کے افراد کی زندگیوں کو بہتر بنانا۔ انھوں نے جب آنکھ کھولی تو مغربی اقوام دنیا کے بیشتر ممالک پر بالواسطہ یا بلاواسطہ قابض ہو چکی تھیں۔ افریقہ اور ایشیا کے بہت بڑے حصے پر متصرف ہونے کی وجہ سے ان کی زبانیں اور زبانوں کے ذریعے سے ان کی تہذیب محکوموں کے لیے قابل تقلید بن چکی تھی۔ بقول اکبر الہ آبادی:

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیّاد کے اقبال کا

.....

یہ درست ہے کہ بعض اسلامی ممالک میں احیائی تحریکوں کا آغاز ہو چکا تھا مگر ان کے اثرات محدود تھے بلکہ ان کی وجہ سے محکوم ملکوں کے تضادات اور بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ مسلمان ممالک ایک ایک کر کے آزادی سے محروم ہو چکے تھے۔ ملّتِ اسلامیہ کے مختلف طبقات یا تو حکمرانوں کے مقلد بن چکے تھے یا پدرم سلطان بود کے خواب میں مست پڑے تھے۔ ان حالات میں قوم کے کسی بھی خواہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اردگرد کے حالات سے آنکھیں بند کر لے اور قوم کو ماضی کے سپنوں میں پڑا رہنے دے۔ سرسیّد احمد خاں، حالی، شبلی، نذیر احمد، اکبر الہ آبادی اور دوسرے بہت سے ادبا اور شعرا اپنے اپنے انداز میں ہندوستانی مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ علامہ اقبال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔ وہ چونکہ مفکّر شاعر تھے اس لیے انھوں نے اس مسئلے پر مسلسل غور کیا کہ ملّتِ اسلامیہ زوال کا شکار کیوں ہو گئی۔ آخر وہ زوال کے اسباب تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اپنی بہترین صلاحیتوں کو ملت اسلامیہ کی خرابیاں دور کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ اقبال کا انتقال ہوا تو بیداری کا آغاز ہو چکا تھا۔ بہت سے مسلمان ممالک رفتہ رفتہ آزاد ہونے لگے۔ اس وقت دنیا بھر میں متعدد آزاد مسلم ممالک موجود ہیں جن کے پاس افرادی قوت بھی ہے اور بہت سے ذرائع بھی۔ ان کے پاس وسیع زرعی رقبے بھی ہیں اور تیل کے ذخائر بھی، مگر ابھی تک محدود طور پر وہ دنیا میں اتنے موثر نہیں ہیں جتنا کہ انھیں اپنی آبادی اور وسائل کے اعتبار سے ہونا چاہیے۔ ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ آخر ملت اسلامیہ دنیا بھر میں بدستور غیر موثر کیوں ہے؟ اس سوال کے ایک یا ایک سے زیادہ جوابات تلاش کرنے چاہئیں۔ ان پر عام بحث

خواجہ محمد زکریا

ہونی چاہیے اور پھر جس بات پر اجماع اُمت ہو اسے ملّتِ اسلامیہ کا مشترکہ مقصد بنا کر بروئے کار لانے کے لیے ہمیں اپنی تمام تر کوششیں اسی ایک سمت میں مرکوز کر دینی چاہئیں۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم و نثر میں ملّت کے زوال کے اسباب سمجھنے کی کوشش کی ہے اور زوال سے اُبھرنے کا ایک واضح طریق کار متعین کیا ہے۔ یہ طریق کار ہے فرد کی اصلاح سے ملّت کی اصلاح کی طرف جانا۔ لیکن علامہ اقبال اس بات سے واقف تھے کہ عام افراد کبھی اپنی اصلاح نہیں کر سکتے کیونکہ وہ زوال آمادہ معاشرے کے شیطانی چکّر میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر کسی بددیانت معاشرے میں کوئی فرد دیانت دار بننے کی کوشش کرے تو وہ معاشرے کو ذرا سا بھی درست نہیں کر سکے گا، البتہ ہو سکتا ہے کہ اس کشمکش میں وہ خود ہی مٹ جائے۔ اس لیے اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصلاح اوپر سے نیچے آتی ہے، نیچے سے اوپر نہیں جاتی۔ نظریۂ خودی مردانِ کامل کو پیدا کرتا ہے اور مردانِ کامل دنیا کی اصلاح کرتے ہیں:

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح
ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر
چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر

نوعِ انساں مزرعِ و تو حاصلی
کارروانِ زندگی را منزلی

.....

جب کسی قوم کو اس قسم کے چند مردانِ کامل یا غیر معمولی صلاحتیں رکھنے والے چند افراد میسر آ جاتے ہیں تو اس قوم کو کاروانِ منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام کلام اقبال کی رجائیت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ٹھیک ہو جائیں تو دنیا کی بہترین اقوام میں شمار ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال ہر حال میں رجائیت کے پیامبر ہیں۔ انھوں نے بار بار ملت کے مختلف افراد اور طبقات پر شدید تنقید کی ہے۔ خود انتقادی اور خود احتسابی کو لازمہ ترقی بتایا ہے اور یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ جب تک ہم اپنی خرابیوں کو تلاش نہیں کریں گے اس وقت تک اصلاح کا عمل شروع نہیں ہو سکے گا۔ اس وجہ سے اقبال کے ہاں ملت کے مختلف طبقات و افراد کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی خرابیوں کو طشت از بام کر کے ان کی اصلاح کا لائحہ عمل تجویز کیا گیا ہے۔

میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں اقبال ملت اسلامیہ کے رہنماؤں سے بہت زیادہ گلہ مند تھے۔ نظم ''شمع اور شاعر'' میں شاعر درحقیقت رہنمائے ملت کی علامت ہے اور پوری نظم ملت اسلامیہ کے زوال کا ایک خوفناک مرقع ہے اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ ملت نے باصلاحیت رہنما پیدا کرنے بند کر دیے ہیں۔ یہ خیال کلام اقبال میں

آخر تک موجود ہے:

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی
فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے
نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے
نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہیدِ کلیم الٰہی
میرِ سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف
منزلِ راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

.....

ایک جگہ تو انھوں نے نام بھی گنوا دیئے ہیں:

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

.....

مصطفیٰ کمال پاشا اور رضا شاہ پہلوی نے اپنی اپنی قوم کے لیے بہت کام کیا لیکن وہ اس معیار کا نہیں تھا، جس کے متمنی اقبال تھے۔ یہ حضرات اور ملّتِ اسلامیہ پر مسلّط ہونے والے دیگر آمر شہنشاہ راہنما اور علماء ان صلاحیتوں سے عاری تھے جو ملت دنیا کی منتخب ملت میں بدل سکتی ہیں۔ اس وجہ سے اقبال ان کا گلہ گزار رہے۔ جن رہنماؤں سے اقبال نے توقعات وابستہ کیں، انھیں ان کی قوم نے یا مغرب کی سازشوں نے کام کرنے کا موقع نہ دیا۔ نتیجہ یہ کہ ملّت فیض حاصل کرنے سے محروم رہی اور حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام کا آج بھی سب سے بڑا مسئلہ رہنماؤں کی کمی کا ہے۔ اس وقت تک کسی اسلامی ملک کا کوئی رہنما اپنے آپ کو ملّتِ اسلامیہ کا حقیقی قائد تسلیم نہیں کر سکا۔ وہ ایک دوسرے کو قریب لانے کے بجائے اختلافات پر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور ملّت کو مزید تقسیم کر کے چلے جاتے ہیں۔

رہنمایانِ ملّت میں علمائے دین اور سجادہ نشین خانقاہ بھی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں، جس طرح سیاسی رہنما انحطاط پزیر ہوئے اسی طرح صُوفی و مُلّا بھی زوال کا شکار ہوئے۔ عالم اسلامی میں مساجد اور خانقاہیں کثرت سے ہیں - خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں خانقاہی سلسلہ بے حد وسیع ہے - کروڑوں لوگ مسجدوں اور خانقاہوں میں جاتے ہیں اور علما وصوفیا سے فیض پانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ مسجدوں کے ائمہ اور خانقاہوں کے صوفیا الّا ماشاء اللہ ملّت کے عام افراد سے بہتر نہیں ہیں۔ ان میں وہ تمام خرابیاں راہ پا چکی ہیں جو عام لوگوں میں موجود ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن میں واضح تضادات موجود ہیں - مذہب اور تصوف نے ان کے دل و دماغ روشن نہیں کیا - وہ روایتی طور پر چند رسوم و عبادات انجام دیتے ہیں اور پھر ان تمام برائیوں میں عملی طور پر ملوّث ہو جاتے ہیں جو

مذہب و تصوف کی ضد ہیں۔ پیروں نے ''نذرانوں'' سے اپنے محل تعمیر کر لیے ہیں اور علمائے دین نے فرقوں کے اختلافات کو اُبھار اُبھار کر اپنی حیثیتیں بنالی ہیں۔ اس لیے مسجد و خانقاہ مُردہ ادارے بن کر رہ گئے ہیں جہاں سے کوئی مردِ مومن پیدا نہیں ہوتا۔ مسجد و خانقاہ کے وارثوں سے اختلاف رائے کرنا اپنی تکفیر کرانے کے مترادف ہے۔ فروعی مسائل میں قوم کو اُلجھا کر اس کی صلاحیتیں ضائع کی جا رہی ہیں۔ مختلف مسالک کے افراد ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں اور جو طاقت اغیار کے خلاف استعمال ہونی چاہیے وہ آپس میں لڑ لڑ کر تقسیم ہو رہی ہے۔ اقبال اپنے دور کے علماء دین، مفتیانِ شرع اور صوفیا سے بہت بیزار تھا۔ شاید اس کے کلام میں سیاسی رہنماؤں سے بھی زیادہ تنقید کا نشانہ علماء و صوفیا کو بنایا گیا ہے:

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے
مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی
یہ پیرانِ کلیسا و حرم اے وائے مجبوری
صلہ ان کی کدو کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری

.....

علما و صلحا کے بعد اقبال کی تنقید کا نشانہ اہل مدرسہ بنے ہیں جن میں اساتذہ اور طلبہ دونوں شامل ہیں۔ اقبال کو اساتذہ سے یہ گِلہ ہے کہ وہ طلبہ کو نصابات پڑھاتے رہتے ہیں مگر ان کے اذہان کی تربیت نہیں کرتے۔ طلبہ نصابات میں اُلجھے رہتے ہیں۔ مشاہیر کے اقتباسات رٹ کر امتحانات میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں مگر ''صداقت'' کی تلاش ان کا مطمحِ نظر نہیں بنتی۔ چنانچہ اقبال کبھی تو مُلا، صوفی، طالب علم اور استاد کو الگ الگ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور کبھی ان کو یکجا کر کے ان کی خرابیوں کو واضح کرتے ہیں:

ان حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خون دلِ مرداں ہو جس فقر کی دستاویز
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی
میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا
تمھارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
انھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ
کتابوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے؟
خراب کوشک سلطان و خانقاہ فقیر
فغاں کہ تخت و مصلی تمام زراقی
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلائی و پیری
میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائل نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب

مُلّا کی نظر نُورِ فراست سے ہے محروم
بے سوز ہے میخانہ صوفی کی مے ناب

.....

اقبال چاہتے ہیں کہ کورانہ تقلید کے بجائے ملّت کے افراد سچائی کی تلاش کے لیے تحقیق و تدقیق کے راستے پر چلیں۔ یہ گو بڑا کٹھن راستہ ہے۔ پُرخار اور طویل، مگر اس کو اختیار کیے بغیر منزل پر پہنچنا ممکن نہیں۔ لیکن حالات یہ ہیں کہ صوفی، مُلّا اور استاد کسی کو آزادیِ اظہار دینے کے لیے تیار نہیں۔ یہ کیفیت ہو تو تحقیق کیسے پنپ سکتی ہے۔ یہ بات بلاوجہ نہیں کہ اقبال کے ہاں تحقیق اور صداقت کی تلاش پر اتنا زور دیا گیا ہے:

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی

فقیہہِ شہر کی تحقیر کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ مَیں ڈھونڈتا ہوں دل کی کُشاد
کیے ہیں فاش رموزِ قلندری مَیں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

حلقۂ شوق میں جرأت رندانہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھُونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

.....

اور ایک دعائیہ نظم میں کہتے ہیں:

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینوں میں اُجالا کر دل صورتِ مینا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

.....

صداقت کی تلاش اور تحقیق کی تڑپ پر اقبال نے جب اتنا زور کلام صرف کیا ہے تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا اقبال کو خرد دشمن کہنا درست ہے یا یہ محض غلط فہمی ہے؟ انھوں نے عشق کی توصیف میں بہت نغمے گائے ہیں اور قوتِ عمل کو ابھارنے کے لیے عقل پر تنقید بھی کر دی ہے، مگر انھیں معروف معنوں میں عقل مخالف قرار دینا درست نہیں۔ جو شخص مندرجہ ذیل شعر لکھے وہ عقل کا مخالف نہیں ہو سکتا:

بتاؤں تم کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں

.....

جب وہ ہمیں بار بار تند بر اور تحقیق کی تلاشِ صداقت پر اُکساتے ہیں تو یہ باتیں عقل کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ اگر جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے نمود ہوتی ہے تو اقبال افکارِ تازہ کی دعوت دیتے ہوئے عقل کے مخالف ہو ہی نہیں سکتے کہ افکار کا تعلق عقل سے ہے۔ اب اقبالیات کے ماہرین کو چاہیے کہ ہماری جذباتی قوم کو نعروں پر زندہ رکھنے کے بجائے اسے غور و فکر کی دعوت دیں۔ جب کوئی قوم غور و فکر کے بعد اپنا ہدف متعین کر لیتی ہے تو عشق کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔ جب آپ کو یقین ہو جائے کہ آپ نے اپنے مقاصد کا تعین کر لیا ہے، اس وقت ان کے حصول کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے کا مرحلہ آتا ہے، اور اسی کا نام عشق ہے۔ مگر اس

کے بغیر قوم کی جذباتیت پیدا کرنے کا مقصد محض ان کو آپس میں لڑانا اور تقسیم کرانا ہی ہوسکتا ہے۔ مثلاً پاکستان کے فرقہ وارانہ، لسانی، علاقائی، اقتصادی، سیاسی مسائل پر جس قدر از سرِ نو غور کرنے کی آج ضرورت ہے شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ لیکن اقبالیات کے جلسوں میں محض چند جذباتی یا روایتی باتیں کہہ کر لوگ رخصت ہو جاتے ہیں اور کسی ایک فرد کے دل میں تحقیق و اکتشاف کی ایک لہر بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اقبال ملتِ اسلامیہ کے ایک بہت بڑے مفکّر ہیں مگر اُن کی سوچ کو چند فرسودہ باتوں تک محدود کر دینا نہ تو اقبال کے ساتھ انصاف اور نہ ہی ملّتِ اسلامیہ کی خدمت ہے۔

اقبال ملّت کے افراد کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے یا ذاتی اغراض سے بلند ہو کر سب کی بھلائی کے لیے کام کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ رہنماؤں اور مقتدر طبقات کی توجہ خود احتسابی اور خود انتقادی کی طرف دلاتے ہیں، جس کے بغیر اصلاح ممکن ہی نہیں۔ خوش فہمیوں میں مبتلا قومیں اپنی کمزوریوں کو دُور نہیں کر سکتیں۔

صدر ایوب خاں کو بعض مشیروں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ذرائع ابلاغ اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے ذریعے ملک کے لوگوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ ہمارے ہاں سب ٹھیک ہے۔ تعمیر و ترقی کا کام بڑی تیز رفتاری سے جاری ہے۔ لوگ بے حد خوشحال ہیں۔ ان کے مسائل حل ہو چکے ہیں چنانچہ ملک کی خرابیوں کا ذکر ختم کر دیا گیا اور ترقی ترقی کی گردان شروع ہوگئی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ جب ایوب خان رخصت ہوا تو سقوط ڈھاکہ کے لیے زمین ہموار ہوگئی تھی اور ادھر لوگ ذرائع ابلاغ کے اس پرچار میں اتنے محو تھے کہ حقیقت سے بالکل بے خبر ہو کر رہ گئے تھے۔ اسی قسم کی رجائیت کسی قوم یا ملک کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔ ہمیں آنکھیں کھول کر اردگرد کے حالات کا مشاہدہ کرنا اور فکر و تدبر سے مسائل کا حل دریافت کرنا ہے اور حل دریافت کرنے کے بعد جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم سے منزل کی طرف بڑھنا ہے۔ ہماری قوم کی بڑی صلاحیتیں مضمر ہیں۔ ہمارے ذرائع بے پناہ ہیں۔ ہماری ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہے تو ہماری اپنی خرابیاں ہیں۔ ان خرابیوں کو دُور کیجیے تو آپ دنیا کی منتخب ترین قوم بن جائیں گے۔ ان شاءاللہ!

ان اللہ لا یغیرُ ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم

یہی اقبال کی رجائیت ہے اور یہی اس کا پیغام ہے:

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

ہے یاد مجھے نکتہ سلمان خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لیے تنگ

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنید و بسطامی

☆☆☆☆☆

مائی ڈیئر سر: خواجہ محمد زکریا

۱۹۸۳ میں یعنی آج سے کم وبیش چالیس برس قبل ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کے گھر رچنا بلاک علامہ اقبال ٹاؤن میں ہوئی تھی۔ دراصل ان کے تلمیذ عزیز اور میرے استاد مکرم (مرحوم) ڈاکٹر نیر صمدانی نے ان سے ملنا تھا۔ ان دنوں میں جز وقتی طالب علم اور کل وقتی صمدانی صاحب کا ڈرائیور ہوا کرتا تھا[1] چنانچہ ہم دونوں موٹر سائیکل پر شام کے بعد خواجہ صاحب کی اقامت گاہ پہ پہنچے۔ سر کے نام سے پہلے ہی واقفیت تھی۔ میرا مؤدب ہونا تو بنتا تھا مگر یہ بہت تپاک سے ملے! رہی ان کی شخصیت کی دلآویزی تو اس عمر میں بھی یہ[2] اتنے پُرکشش ہیں، تینتالیس سال کی عمر میں کیا قیامت ہوں گے! کسی جمال دوست کے لیے نہایت شفاف تعین تک رسائی کچھ دشوار نہیں۔ سچی بات ہے وہ گھڑی فیصلہ کن ثابت ہوئی کہ اورینٹل کالج منزل قرار پا گیا ___ تین سال گزرے، خواب پورا ہوا، کلاس روم میں خواجہ صاحب پڑھا رہے تھے اور یہ عاجز ایک سٹوڈنٹ کے طور پر ان سے مستفیض ہو رہا تھا ___ لیکن ایک مسئلہ ہو گیا کہ سر صرف پڑھاتے تھے اور مذکورہ مدرسے میں داخل ہوتے ہی ہمارے لیے گویا دبستان کھل گیا! ایسے ایسے 'ضروری کام' نکل آئے کہ پڑھنا پڑھانا غیر ضروری تو نہیں ہوا البتہ کچھ ثانویت کی اختیار کرنے لگا۔ اس پر خواجہ صاحب کی بیوٹی کے ساتھ ساتھ میجیسٹی نے بھی ظہور کرنا شروع کر دیا۔ سیڑھیوں، راہداریوں یا کسی بھی گوشے میں کسی بھی گریجویٹ کو مغلوط علمی بحثوں کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ سو، ہمیں بہ امر مجبوری میوزیم کے آثار قدیمہ اور لارنس گارڈن کے نقوش جدیدہ سے تعلق خاطر کو فروغ دینا پڑا۔ وہ جو کہتے ہیں: 'تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے!' شعبے کے طلبا و طالبات نے سالگرہ منانے کے لیے لاہور کے تاریخی مقامات کا انتخاب کیا۔ ریشمی رومال تحریک سے متاثر ہو کر بہت خفیہ طریقے سے پروگرام ترتیب دیئے جاتے، پھر کوڈ ورڈز میں دعوت ناموں کی ترسیل ہوتی ___ ابھی اس

جمیل احمد عدیل

سلسلے کی دو تین تقاریب ہی منعقد ہوئی ہوں گی کہ سر نے ایک روز کلاس میں خوب کلاس لی: مجھے اچھی طرح معلوم ہے تم لوگ چٹوں پر لکھ لکھ کر جن اجتماعات کا انعقاد کرتے ہو، آیندہ اگر کسی نے ایسی حرکت کی تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہو گا! ہماری تو روح فنا ہو گئی! سب ایک دم سہم گئے! ہم میں سے جو ہوسٹل میں مقیم تھے، امور آوارگی کی سٹینڈنگ کمیٹی کے تاحیات چیئرمین اشفاق احمد ورک کی زیرِ صدارت فوری ہنگامی اجلاس پر اتر آئے۔ جس کا ایجنڈا یہ نہیں تھا کہ خواجہ صاحب تک یہ اطلاع پہنچی کیسے؟ بلکہ عقدہ یہ تھا کہ ان چٹوں کی عبارتوں کو انھوں نے ڈی کوڈ کیسے کر لیا؟ یوں تو اس کا فلمی جواب بھی ممکن تھا: 'جس سکول میں تم پڑھتے ہو ہم ہیں وہاں کے ٹیچر!' لیکن علمی جواب شاید زیادہ مسکت ہو گا، ایک روز خواجہ صاحب ہی نے کلاس روم میں بتایا تھا کہ حافظ محمود شیرانی مخطوطہ چکھ کر بتا دیتے تھے، یہ کتنا پرانا ہے! اور سر بھی محقق ہیں، چٹ کو دور ہی سے دیکھ کر نفسِ مضمون کو سمجھ جاتے ہوں گے۔ اس کے بعد ہم نے کیا حکمتِ عملی اپنائی؟ اسے بھید ہی رہنے دیجیے کہ اس رومانوی تحریک کے باقی ارکان اب جانے کہاں ہیں؟ ان کے حصے کی سرزنش بھی آج مجھ اکیلے کو بھگتنا پڑ جائے گی!!

اگر اسماء الرجال کے لغت میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے مترادفات تلاش کیے جائیں تو بالیقین وہ یہی ہوں گے: باوقار، بارعب، محترم، صاف گو، خوش لباس، گریس فل، عالم، دانشور، خوددار، اعلیٰ اخلاقی قدروں پر سختی سے کاربند، بہترین استاد، اصول پسند منتظم۔۔۔ جیسے بالی وڈ میں دلیپ کمار 'صاحب' سے موسوم رہے ہیں اسی طرح ہمارے خواجہ صاحب ان تین پاکستانیوں میں سے ایک ہیں جن کے نام 'صاحب' کے لاحقے بنا ادا نہیں ہو سکتے: جی جناب:

☆ بھٹو صاحب

☆ فیض صاحب

☆ خواجہ صاحب

مجھے اچھی طرح یاد ہے اورینٹل کالج میں ایک تقریب کے دوران تقریر کرتے ہوئے میں نے کہیں کہہ دیا کہ ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کو پروفیسر کے بجائے ڈپٹی کمشنر یا ایس پی ہونا چاہیے تھا تو انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کچھ خفگی کا اظہار کیا۔ تو سر! یقین کیجیے ایسا میں نے آپ کے جلالی ہونے کے جزوی وصف کے کارن نہیں کہا تھا بلکہ آپ کی بے حد خوبصورت، قابلِ رشک اور شاندار شخصیت کے اعتراف میں اپنا قلبی جذبہ ظاہر کیا تھا۔ پروفیسر تو بے چارے ہم جیسے نمانے سے ہوتے ہیں۔ پروفیسر کے گھر چور آ کر پیسے ڈھونڈنے لگے تو وہ خود بھی اس کے ساتھ مل کر رقم تلاش کرنے لگ جاتا ہے، پر چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں! فارسی والوں کی تسلی کے لیے:

دزد از خانہ مفلس خجل آید بیروں

خواجہ زکریا صاحب کے بارے میں دو رائے نہیں کہ حقیقتاً یہ انتہائی خوش طبع ہیں؛ بے پناہ ذکاوت کے مالک؛ مزیدار فقرے پر زندہ قہقہے سے ماحول کو مزین کر دینے والے اور مجلسی[1] آدمی ہیں لیکن اپنی ذات کو کسی نے یوں توازن بدوش نہیں کیا ہو گا کہ کوئی قلب کے نہاں خانوں میں بھی ان کے حوالے سے سوئے ادب کی بابت سوچ

سکے۔ جناب ڈاکٹر ریاض قدیر کے مطابق: ''اگر کوئی مخاطب بے تکلف ہو کر گفتگو کو غیر رسمی حدود میں لے جانے کی کوشش کرے گا، آپ کمال مہارت سے مخاطب کی امیدوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔'' کوئی پچیس سال پرانی بات ہوگی پی سی میں ایک بڑی تقریب[۳] کی نقابت کے فرائض ہمارے پیارے مزاح نگار اعجاز رضوی ادا کر رہے تھے۔ وہ ہر مقرر پر شگفتہ، تیکھا، ظریفانہ، پُر لطف جملہ کس رہے تھے؛ مقررین سمیت تمام حاضرین محظوظ ہو رہے تھے۔ جب خواجہ صاحب کی باری آئی تو انھوں نے بس اتنا ہی کہا:

''اب تشریف لاتے ہیں ملک کے ممتاز نقاد اور محقق جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا!!''

خواجہ صاحب نے گفتگو یہاں سے شروع کی: ''ابھی اعجاز رضوی ہر اظہار خیال کرنے والے کے حسب حال فکاہیہ جملہ ادا کر رہے تھے تو میں توقع بلکہ خواہش کر رہا تھا کہ میرے متعلق بھی یہ کچھ ایسا ہی کہتے کہ میں اسے انجوائے کرتا۔''

دوستو! میں نے اس دوران اعجاز رضوی کے چہرے کا تاثر پڑھنے کی کوشش کی۔ وہاں بڑی واضح عبارت درج تھی:

'ناں! سر جی! میرے چھوٹے چھوٹے بچے نیں، میں ماڑی پسلی دا بندہ واں، میری اینی مجال نہیں، تسیں وسدے رہو تے خوش رہو!'

واقعہ یہ ہے کہ میں نے زندگی میں صرف ایک شخص کو دیکھا ہے جو سر کو بے تکلفی سے، بنا کسی سابقے/لاحقے کا سہارا لیے مگر بہت پیار کے ساتھ نام لے کر مخاطب کرتے تھے اور وہ تھے (مرحوم) اشفاق احمد! فی الاصل Distance ایک راز ہے! Personal Zone کیا ہے؟ Private Zone کیا ہے؟ Public Zone کیا ہے؟ ان کے درمیان فرق سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ خواجہ صاحب تو اتنے محتاط ہیں کہ تقریبات میں پروفیشنل فوٹو گرافر کو بار بار تاکید کرنا پڑتی ہے: سر! ذرا ساخاتون کے قریب ہو جائیں، تصویر کٹ رہی ہے___ درآں حالے کہ ہم نے ان فوٹو گرافرز کو بعض عادی احباب کی نسبت سے اس کے برعکس 'Request' جھاڑتے دیکھا ہے:

'بھائی جی! بی بی کولوں ذرا پرانہہ ہو کے کھڑے ہووو، اینے بندے اک فوٹو وچ نئیں آنے!'

اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب کو میری زندگی بھی لگا دے! مگر ہونا یہی ہے جنت میں حوروں نے تنگ آ کر اللہ میاں کو ان کی شکایت لگا دینی ہے کہ کچھ زیادہ ہی کم آمیز ہے مومن[۴]! ایسا رجحان تو ہمارے 'حاضر سروس پارساؤں' میں بھی نہیں پایا جاتا، اسی لیے تو علامہ اقبال نے انھیں پہچان کر مقدور بھر نشاندہی کر دی تھی:

امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

صاحبو! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کی Big Achievements کا ذکر ہو اور (مرحوم) مجید امجد کا حوالہ نہ آئے___ آج دنیا اگر مجید امجد کے نام اور کام سے آگاہ ہے تو اس میں نوے فی صد

کردار خواجہ صاحب کی محنتوں اور محبتوں کا ہے___ اس سر سے بھی پردہ نہ سرکایا جا سکا کہ قدرت کسی کے دل میں کسی کے لیے کیوں محبت کی شمع فروزاں کر دیتی ہے؟ بہرطور مجید امجد سے وابستہ ہر نقش کو نقش دوام میں بدل ڈالنے کا اعجاز ڈاکٹر صاحب کا وہ اختصاص ہے، جس میں کسی اور کو ایسی شرکت کا اعزاز نصیب نہیں ہو سکا۔ ایک بار انھوں نے بتایا کہ مجید امجد کو علم ہیئت (Astronomy) سے گہرا شغف تھا اور دو نئے ستارے دریافت کر کے اجرام فلکی کے ماہروں کو اس شاعر نے حیران کر دیا! مجھے تو باوجود کوشش کے ان ستاروں کے اوکھے اوکھے نام ہی آج تک یاد نہیں ہو سکے اور خواجہ صاحب نے ان کے شجرے کی تمام تر تفصیلات مع اصل ستاروں کی فوٹو کاپی کے، مجید امجد کی غیر مطبوعہ تخلیقات والی فائل میں لگا لی ہوئی ہیں۔ اسی طرح جب خواجہ صاحب امریکا گئے تو غالباً نیویارک سٹی کے ایک میگا بک سٹور سے مجید امجد کی نظموں کے انگلش ترجمے والی نایاب کتاب ڈھونڈ نکالی جس کے ملنے کا امکان معدوم ہو چکا تھا۔ واپس آ کر انھوں نے اپنے صاحبزادے سے کہا: نیٹ پہ سرچ کر کے دیکھو، کیا یہ کتاب دنیا میں کہیں اور ہے؟ کافی چھان پھٹک کے بعد پتا چلا اس کا ایک ہی اور نسخہ موجود ہے___ خواجہ صاحب نے یہاں تک بات سنائی تو میرا بے اختیار جی چاہا، بول پڑوں: سر! یہی معلوم ہوا ہوگا نا کہ وہ نسخہ پہلے ہی سے آپ کے گھر میں موجود ہے؟

ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کے ہاں ایک جوہر ایسا ہے جواب تک کہیں سے نظیر فراہم نہیں کر سکا کہ ان کی تحریر ہو یا تقریر اس قدر Exhaustive اور اختصار و جامعیت (Concision) کی مظہر ہوتی ہے کہ الفاظ اپنے متعین معانی کے پیش کار ہو جاتے ہیں۔ اس قدر قطعیت، ایسی حتمیت، ابہام کا نام و نشان تک نہیں؛ بالکل دوٹوک نتائج آفرینی___ ایسی Transparent Approach برسوں کی ریاضت کے بعد بھی شاید ہما شما کو میسر نہ آ سکے۔ واقعۃً اتنی Clarity ان کے کسی معاصر کے ہاں دکھائی نہیں دیتی اور اس خوبی کا اظہار صرف علم و ادب کے نظری مباحث تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے عملی نشیب و فراز کی مناسبت سے بصیرت اور Wisdom کا خزینہ بھی انھیں فیاضی سے عطا ہوا ہے۔ جن باتوں سے ہم سر پھروں کو روکتے رہے، ان کے سخت تر نتائج مآل کار سامنے آ کر رہے! بلاشبہ 'حرف ناصح' برا نہیں ہوتا!

لفظ کی کیمسٹری کے بھی آپ 'الکیمسٹ' ہیں۔ باون تولے پاؤ رتی درست تلفظ، حساسیت کی حد تک موزوں استعمال! کلاس میں پہلے دن ہی انھوں نے بلیک بورڈ پر اپنا نام لکھ کر مطلع نہیں کیا باقاعدہ متنبہ کیا: ''زکریا 'ز' سے لکھنا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا املا اسی طرح ہے!'' ایک موقع پر انھوں نے بتایا 'رویہ' اور 'لفاظی' مثبت معانی کو ظاہر نہیں کرتے۔ 'بوریت' لکھنا، پڑھنا بلکہ سننا بھی جہالت ہے۔ 'زبان زد عام' صحیح نہیں، درست 'زباں زد عام' ہے، پروا کے بعد ہائے ہوز (گول ہ) لکھنا گناہ کبیرہ ہے!

ذرہ اور ذرا کے فرق کو واضح کیا[1]۔

خواجہ صاحب کے ہاں نامانوس لفظوں سے گریز کا میلان ملتا ہے مگر منفرد الفاظ ان کے ہاں ممنوع نہیں ہیں۔ سعد اللہ شاہ کی پہلی کتاب (بادل، چاند، ہوا اور میں) کے فلیپ میں انھوں نے 'نوخاستہ نوجوان' لکھا تو مجھے یہ اتنا پسند آیا کہ معنی تو کئی سال بعد معلوم ہوئے لیکن ان دنوں اپنی ہر تحریر میں کھینچ کھانچ کر 'نوخاستہ نوجوان' لے آتا تھا۔ فرحت پروین کی: ''بزم شیشہ گراں'' کی تقریظ میں 'جز بیلے یا جذ بیلے جملے' کے شبد لائے ہیں۔ اب اگر پندرہ سال میں اس کے معانی کسی نئی پرانی فرہنگ سے نہیں مل سکے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے، اپنے کالموں کو دلکش حروف کے اس مجموعے سے محروم کر دیا جائے؟ آج یہ تسلیم کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ 'بہر طور' اور 'بہر صورت' کو خواجہ صاحب ہی کی پیروی میں تکیہ کلام بنایا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں تو خواجہ صاحب کے لب ولہجہ کو کاپی کرنے کی اتنی پریکٹس ہو گئی تھی کہ کلاس فیلوز باقاعدہ فرمائش کر کے سنا کرتے تھے ــــ وہ تو خیر گزری کہ اصرار کے باوجود میں نے ان ستمگروں کی بات نہ مانی کہ مجھ سے کہا یہ جا رہا تھا: سرکی آواز میں ان کے گھر فون کر کے کہو: 'انڈیا سے اٹھارہ ادیبوں کا وفد آیا ہوا ہے، ان کے لیے پرتکلف ڈنر کا بندوبست کیا جائے!' اگر بالفرض میں ایسا کر گزرتا تو شریک جرم احباب ہی نے مخبری کر دینی تھی اور خواجہ صاحب نے میرے ڈکرے کرا کے شب دیگ چڑھا دینی تھی! تاکہ ایمان کی حرارت والوں کے شایان شان ضیافت کا انتظام کیا جا سکتا! آخر میں مجھے بس اتنا کہنا ہے: مائی ڈیئر سر! آئی لو یو فرام دی کور آف مائی ہارٹ!!

حواشی

۱۔ حق مغفرت کرے! مرحوم نیر صاحب نہایت جز رس واقع ہوئے تھے۔ اس لیے سواری اور ایندھن (Vehicle and Fuel) کی فراہمی نیز ہر نوع کے مشاہرے/وظیفے سے بخوشی دستبرداری ان کے ہاں حصول ملازمت کی لازمی شرائط تھیں۔

۲۔ تاریخ ولادت: ۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء

۳۔ ملک مقبول احمد کے بقول:

''خواجہ محمد زکریا ۔۔۔ نے اپنے جھگڑی مزاج کو، جس میں جمالیات کا زاویہ اور محبت کا عنصر نمایاں ہے، قائم رکھا ہے اور وہ اورینٹل کالج کے تمام اساتذہ سے مختلف نظر آتے ہیں تو اس میں جتنی ہیر کے دلیں کے اثرات موجود ہیں۔''

۴۔ افسانوی مجموعے ''منجمد'' کی تقریب پڑ یائی!

۵۔ انوار احمد کے الفاظ میں: ''خواجہ محمد زکریا حسن اور جوانی کے روبرو ہمیشہ بڑی زوردار مزاحمت کرتے ہیں اور خوبصورت دلوں کو توڑنا اپنا فرض ایمانی خیال کرتے ہیں۔''

۶۔ جیسے صدر ہر جگہ صدر ہوتا ہے، اسی طرح استاد ہر مقام پر استاد ہوتا ہے۔ 2011 میں جب ان کا شعری مجموعہ: ''آشوب'' چھپا تو سوچ آئی، سرکوئی اور نام رکھ لیتے کہ: ''درد آشوب'' پہلے سے موجود ہے ــــ لیکن پھر جلد ہی مرحوم جعفر بلوچ کی تائید میں اس خیال نے مسکرانے پر مجبور کر دیا ــــ انھوں نے دراصل احمد فراز کی غلطی نکالی ہے کہ آشوب میں درد کا مفہوم موجود ہے۔

نوٹ: اس خاکے کا پہلا متن خواجہ محمد زکریا صاحب کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر حلقہ ارباب ذوق کے خصوصی اجلاس (۲۰۱۵) میں پڑھا گیا تھا۔ قدرے حک و اضافہ زیر نظر 'ارمغان' کے لیے موثر ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆

خواجہ محمد زکریا ___ مختصر آرا

.....احسان دانش.....

''ایک نوجوان معلم ہیں اور تاریخ کے ہر دور پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اپنی معلومات اور فیض مطالعہ سے اپنے تلامذہ کو مطمئن کر دیتے ہیں اور یہ استاد کے لیے بڑی کامیابی کی بات ہے۔ وہ خود تندرست نوجوان ہیں اور افکار و خیالات بھی نوجوان رکھتے ہیں، ایسے معلم سے کون ہو گا جو مستقبل کی امیدیں وابستہ نہیں کرے گا۔''

.....سلیم اختر.....

''مجھے جب کبھی کسی کتاب کا ٹائٹل، شعر معلوم کرنا ہو تو خواجہ صاحب سے رابطہ کرتا ہوں۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ معلوم نہیں۔ یوں لگتا ہے ایک بٹن دباؤ فوراً جواب حاضر ہے۔ ان کی یادداشت کمپیوٹرائزڈ ہے۔''

.....اجمل نیازی.....

''جب بھی کسی بات میں الجھ گیا تو میں نے خواجہ صاحب کو فون کیا۔ کیسے کیسے سمندر اس شخص کے اندر ہیں کہ فوراً بڑی سے بڑی علمی اور ادبی مشکل آسان کر دی۔ خواجہ صاحب نے بلا کا حافظہ پایا ہے۔ زندگی میں جو کچھ انھوں نے پڑھا ہے یا ان کی نظروں سے گزرا ہے۔ وہ انھیں بھولا نہیں۔''

.....بریگیڈیئر حامد سعید.....

''بعض اوقات شعر کا کوئی ایک مصرع بھی یاد نہیں ہوتا صرف مفہوم بتانے سے بھی شعر مکمل کر دیتے ہیں۔''

یہ خوبی یہ قوت حافظہ خواجہ زکریا کو عطیہ خداوندی ہے۔ وہ انتہائی محبت کرنے والے ملنسار آدمی ہیں ان میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ جو عموماً پڑھے لکھے لوگوں میں کم ہوتی ہے وہ علم کی قدر کرتے ہیں جو علم کی راہ پر گامزن ہو ان کی حوصلہ افزائی بڑی فیاضی سے کرتے ہیں۔

.....سید محمد اکرم شاہ.....

انسان کی شخصیت اس کے داخلی اور خارجی خصائص اور میلانات کا امتزاج ہوتی ہے۔ کئی شخصیتیں ایسی ہوئی ہیں کہ جن کی طرف آدمی خود بخود کھنچا چلا جاتا ہے۔ کچھ شخصیتیں ایسی سپاٹ اور سادہ ہوتی ہیں جن سے کوئی تاثر قائم نہیں ہوتا جبکہ بعض شخصیتیں ناخوشگوار تاثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی شخصیت رومانیت اور حقیقت پسندی کا عجیب تر اور حسین تر امتزاج ہے۔ انسان کے ظاہری خصائص میں شکل و صورت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا چونکہ کشمیری فیملی سے تعلق

رکھتے ہیں، چنانچہ سرخ و سپید رنگت اور تیکھے نقوش کے مالک ہیں۔

.....اظہر جاوید.....

''ماشاء اللہ ذہانت کے ساتھ ساتھ مردانہ وجاہت اور خوبصورتی بھی تھی (اور ہے بھی).....مگر ایمان کی بات ہے یہ انہی پہ صادق آتا ہے۔ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ اقبال کا شعر بھی ان کے کردار کی عکاسی کرتا ہے:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہو بے داغ ضرب ہو کاری

بے داغ جوانی کا بھی میں گواہ ہوں کہ بہت سے نازک مقامات سے خوش اسلوبی سے گزر گئے۔''

.....رحیم گل.....

''چھوٹا منہ بڑی بات، اس محاورے کو اگر میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا پر فٹ کرنا چاہوں تو یوں کہوں گا چھوٹا قد بڑا آدمی۔ ایک بار نیشنل سینٹر میں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔ خواجہ محمد زکریا تقریر کے لیے اُٹھے۔ سٹیج سیکرٹری نے تعارف کرایا.....'اب معروف محقق اور نقاد خواجہ محمد زکریا اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔'' میرے ساتھ معروف افسانہ نگار زیتون بانو بیٹھی تھیں۔ حیرت سے بولی: واہ.....! یہ لاہور شہر واقعی علم کا گوارہ ہے۔ اتنی چھوٹی عمر کے لڑکے لٹریچر میں ڈاکٹر بن جاتے ہیں! میں ہنس پڑا اور بانو کو بتایا۔ ڈاکٹر زکریا لڑکا نہیں ہے، اس کے تو شاگرد بھی پروفیسر بن گئے ہیں۔ البتہ ہم کہہ سکتے ہیں ڈاکٹر محمد زکریا عمر چور ہیں جیسے چینی قوم کے افراد عمر چور ہوتے ہیں۔''

.....ضیا الحسن.....

''میں نے خواجہ صاحب سے زیادہ نفیس لباس میں کسی شخص کو نہیں دیکھا انھیں Casual لباس میں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ جو پہنتے ہیں عمدہ انتخاب ہوتا ہے۔ ان کے لباس کی تمکنت وضع داری رکھ رکھاؤ ہوتا ہے اور ایسا لباس نہیں پہنتے جو زمانے کے رواج کے مطابق ہو، بلکہ وہ اصل لباس پہنتے ہیں جو ان کی شخصیت پر جچتا اور پھبتا ہے۔''

.....مسز شگفتہ زکریا.....

''زکریا کھانے پینے میں پریشان نہیں کرتے کہ تازہ روٹی ضرور پکائیں۔ جو بھی میسر ہو آرام سے کھا لیتے ہیں۔ کچھ تعریف بھی کرتے ہیں کہ اچھا پکا ہے۔ میں سمجھی ہوں کہ کچھ نہیں کہہ رہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔ برائی بھی نہیں کرتے۔ بعض اوقات میں پوچھوں کہ کیسا تھا تو کہہ دیتے ہیں کہ اچھا تھا۔ نخرے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے روٹی پکانا نہیں آتی، اگر ملازم موجود نہ ہو، جو روٹی پکاتا ہے تو جو ڈبل روٹی کھا کر گزارا کر لیتے ہیں۔''

☆☆☆☆☆

یادیں

پچھتر سال میرے پاس سے ایک ایک کر کے اس طرح گزرے
کہ آہٹ تک نہیں آئی
اور اب سو کر جو اٹھا ہوں تو سب کچھ لٹ چکا میرا
غریبوں مفلسوں کے پاس ہوتا ہی نہیں کچھ بھی مگر یادیں
کہ جو اپنے سوا سب کے لیے بیکار ہوتی ہیں
بہت پہلے کا قصہ ہے کہ اک بچہ کسی مفلس گھرانے میں
اک ایسے شہر میں پیدا ہوا جس میں
مذاہب اور تہذیبیں
اکھاڑے اور پتنگیں
شاعری اور راگ داری
گلستان و بوستاں کے درس دیتے مدرسے اور مسجدیں
آہستہ آہستہ زوال آمادہ تھے
جنگ کے سائے تلے
مفلسی، بے روزگاری بھوک کی ماری ہوئی
خلق خدا گن گن کے اک اک دن بسر کرتی تھی ذلت میں اسیری میں
میرے آبا ریلوے کی فیکٹری میں جسم کی طاقت کو
سستا بیچ کر دو وقت کی روٹی کماتے تھے بڑے جتنوں کے ساتھ

اور اب وہ مفلسی باقی نہیں اور تلخ یادیں
وقت کی مٹیالی چادر میں کہیں گم ہو چکی ہیں
لیکن اب یاد آئیں تو کتنی سہانی لگتی ہیں!

خواجہ محمد زکریا

غیر محفوظ بستی

پون صدی پہلے اک لڑکا اس بستی میں آیا تھا
تب سڑکیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور ٹریفک کم تھی
اکثر لوگ جہاں جاتے تھے پیدل جاتے تھے
اُن سے کوئی نہیں کہتا تھا! کدھر جاتے ہو؟
اور اب جہاں بھی دیکھو
گاڑیوں کا اک سیلِ رواں ہے
جن سے بچا کر پیدل چلنا کتنا مشکل ہے!
ہر کوئی مشکوک ہے اب اس پھیلتی بڑھتی بستی میں
ہر سُو خوف کے سائے ہیں
جہاں بھی جاؤ بورڈ لگے ہیں:
''رک جاؤ اور اپنی شناخت کراؤ''
سیکڑوں گاڑیوں کے ہڑبونگ میں بندوقوں کے سائے تلے
بستی کے جمہوری حاکم آتے ہیں
جو جمہوری سے اتنے ترساں اور لرزاں ہیں
ڈر کے مارے تیزی سے سڑکوں سے گزر کر
اپنے اپنے قلعوں میں چھپ جاتے ہیں
جن کے گرد تحفظ کے کتنے ہی دیکھے اور ان دیکھے دائرے ہیں
اب یہ پچھتر سالہ بوڑھا بھی مشکوک ہے اس بستی میں
اب تو وہ اتنا بوڑھا ہے
اس کے واسطے بھاگ کے اور کسی بستی میں جانا بھی ناممکن ہے

خواجہ محمد زکریا

غزل

قریب آ کے بھی آتے نہیں وہ میرے قریب
ہمارا ربط ہے مدت سے پر عجیب و غریب

سمجھ میں آتا نہیں کیوں قریب آتے ہیں
قریب آتے ہیں پھر کیوں انھیں ہے اتنا نہیب

ملے کبھی جو کوئی خوش مزاج و خوش اطوار
پکار اٹھتا ہوں خود ہی کہ واہ! میرے نصیب!

کرم جب اس کا ہو بارانِ تیز کی صورت
تو یہ سمجھتا ہوں کوئی نہیں ہے میرا رقیب

رہی ہے پھر بھی مری بزم دوستاں آباد
ذہین ہوں نہ حسیں ہوں نہ خوش گلو نہ ادیب

جو تھانے دار نہ بن پائے بن گئے اُستاد
وہ جن کو ہونا تھا قصاب بن گئے وہ طبیب

جو پھیرتے ہیں گلِ مہر کی طرح چہرے
اسی قماش کے لوگ اب بنے ہوئے ہیں لبیب

خواجہ محمد زکریا

غزل

جو سیکھی ہیں انھیں مبارک باد
زندگی ایک اور سَو افتاد

اڑتے پتے ہوا کی لہروں پر
میری تیری یہ عمر سب برباد

وقت کے آگے ہو گئے بے بس
کوئی بندہ تھا یا کوئی آزاد

آخرِکار ہو گا خاک بہ سر
ہو کوئی سرکشیدہ یا سجاد

حشر کے دن یہ ختم ہو شاید
سنتے ہیں ہر ستم کی ہے میعاد

دل میں نفرین کہہ رہے ہیں سبھی
اور ہونٹوں پہ ہے مبارک باد

نت نئے ان سے لے رہا ہوں سبق
میرے شاگرد ہیں مرے استاد

اس سے پہلے تھا ایسا عدل کہاں
بچھڑے اب ہیں صاحبِ اولاد

خواجہ محمد زکریا

غزل

میں لاکھ ڈھونڈوں مگر وہ رتیں سہانی کہاں
جدھر بھی دیکھیے خاک اُڑ رہی ہے پانی کہاں

دلوں کا رنگ بھی دھندلا گیا اسی کے ساتھ
شفق کا رنگ وہ پہلے سا ارغوانی کہاں

رواں تھے جو کبھی جوہڑ سے بن گئے ہیں اب
چلی گئی ہے وہ دریاؤں کی روانی کہاں

تمام بھورے ورق اُن کے ریزہ ریزہ ہوئے
کہاں ہیں ڈائریاں اب مری پرانی، کہاں

مری جوانی میں جب کوئی خاص بات نہ تھی
تو کیوں ملال ہو اس کا گئی جوانی کہاں

ہم ایک دوسرے کو رفتہ رفتہ بھول گئے
گزرتے وقت نے دونوں کی بات مانی کہاں

سبھائیں جیسی تھیں آباد اب بھی ہیں آباد
اب اُن میں نفرتیں پاؤ گے پریم بانی کہاں

بلائیں خود نہیں آئیں بُلا کے ہم لائے
یہ خوف ناک بلائیں ہیں ناگہانی کہاں

جو صاف کرنے لگا کل دماغ کی کل مَیں
نہ جانے کھو گئی ایسے میں اک کمانی کہاں

خواجہ محمد زکریا

غزل

رنگِ دنیا ذرا لبھایا نہیں
سبب اس کا سمجھ میں آیا نہیں

اُس نے ساری کتھا سنا ڈالی
پر جو سچ ہے زباں پہ لایا نہیں

کتنے دل کش حسیں نظر آئے
دل میں لیکن کوئی بسایا نہیں

خواب میں نے بھی دیکھے رنگا رنگ
پر انھیں مسئلہ بنایا نہیں

اکثر اوقات ان کو بھول گیا
کہ جنھوں نے مجھے بھلایا نہیں

مطمئن ہوں ضمیر کا سودا
کسی قیمت پہ بھی چکایا نہیں

تیز ہے دھوپ اور سڑکوں پر
وہ شجر ہیں کہ جن کا سایا نہیں

خواجہ محمد زکریا

غزل

ابرِ بہار دل پہ جو چھایا تھا چھٹ گیا
سارا بدن سمٹ گیا ادراک گھٹ گیا

گو زندگی طویل تھی، موت آئی جب قریب
ایسا لگا کہ راستہ جلدی سے کٹ گیا

بوسیدہ کوٹ پہن لیا اور چل پڑے
یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ کالر تو پھٹ گیا

اب کیسا ارتکازِ توجہ ہے، انتشار
جس حافظے پہ ناز تھا ٹکڑوں میں بٹ گیا

کیسا کمال شعر تھا اور کس کا شعر تھا؟
یاد آ رہا تھا ذہن اچانک پلٹ گیا

ہلکان ہو گیا مگر آیا نہ پھر بھی یاد
جھلکی دکھا کے حافظے سے کام جھٹ گیا

اب تو الاسٹک کی طرح مجھے میں ہے لچک
ٹلتا نہیں تھا بات پر اپنی جو ڈٹ گیا

خواجہ محمد زکریا

ثمینہ سید کے افسانے "کہانی سفر میں ہے"

یوں تو میں ثمینہ کو کافی سالوں سے جانتی ہوں۔ ایک فنکشن میں میری ملاقات اس سے ہوگئی۔ اس نے مجھے اپنی کتاب دی۔ میں نے گھر آکر ثمینہ کی کتاب کو دیکھا اور اپنی پہلی فرصت میں اس کا پہلا افسانہ "ہم کہاں کے سچے تھے" پڑھا تو مجھے کافی اچھا لگا۔ سوچا کہ آج کل بیٹی آئی ہوئی ہے لیکن یہ کتاب پھر پڑھوں گی ضرور۔ بیٹی کے جانے کے بعد کتاب بہت ڈھونڈی لیکن نہیں مل سکی۔ کچھ دن پہلے نیلم احمد بشیر کی تقریب میں ثمینہ سے ملاقات ہوئی تو اسے بتایا کہ کتاب مکمل پڑھوں گی۔ اور رائے بھی دوں گی ان شاءاللہ۔

اس افسانوں کی کتاب کا نام "کہانی سفر میں ہے" میرے خیال سے زندگی بھی ایک سفر ہے جو کہانی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بڑی ہی محنت سے میں نے کتاب کو ڈھونڈا۔ اس افراتفری سے بھری دنیا میں گم ہوئی کتاب دوبارہ مل جائے تو اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہوگی۔

یہ افسانوں کی کتاب ہے۔ پہلا افسانہ جو میں پڑھ چکی تھی۔ میں نے پھر پڑھا اور میں اس کی گرفت میں آچکی ہوں۔ میں پڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی آج کے دور سے یہ کہانیاں کتنی مطابقت رکھتی ہیں۔ ہر شخص مختلف ہے اسی طرح اسلوب بھی مختلف ہوتا ہے ہر ادیب کا جی چاہتا ہے کہ وہ اچھوتے انداز میں لکھے۔

ثمینہ بھی اس انداز کو منفرد بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔ بڑا دردمند دل رکھنے والی لکھاری ہیں۔ پیش لفظ میں سلمیٰ اعوان لکھتی ہیں

"ثمینہ کا سادہ، خوبصورت اور پُر تاثیر انداز فنی پختگی کا حامل ہے۔ وہ افسانے میں ثمینہ کا منفرد مقام متعین کررہا ہے۔ اس کے کردار ماورائی یا تخیلاتی نہیں ہیں۔ وہ موضوعات کا انتخاب اپنی اور میری اس دنیا سے کرتی ہے۔ اپنے ماحول اپنے گردوپیش میں بکھرے ہوئے کردار سمیٹتی ہیں۔ ثمینہ اپنے اردگرد پھیلے دکھوں سے

بلقیس ریاض

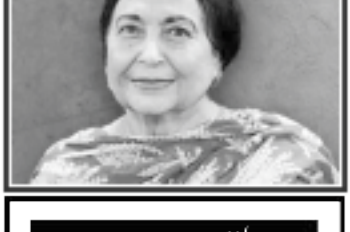

ایک لمحہ بھی غافل نظر نہیں آتیں۔''

میں نے مطالعہ کے دوران ہی محسوس کر لیا کہ ہر کہانی اپنی نوعیت کی بہترین کہانی ہے۔ یہ جزئیات اس کا گہرا ویژن ہے۔ جو وہ مثبت طریقے سے پیش کرتی ہے۔ یوں تو افسانے بہت ہی اچھے ہیں مگر ''مقدمہ'' افسانہ پڑھ کر اس کی سوچ کا گہرا پن محسوس ہوا۔ عام کہانی کو بھی خاص بنا کر لکھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ آج کے دور میں جو ہو رہا ہے۔ نوجوان نسل اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ ہاتھ کر جاتی ہے شادی ہوتے ہی والدین کو چھوڑ کر نئی دنیا بسا لیتی ہے۔ مقدمہ افسانے میں والد نے بچوں پر مقدمہ دائر کر دیا کہ جو میں نے تینوں پر خرچ کیا ہے مجھے واپس کریں۔ اس افسانے میں عدالت میں بیٹھے بوڑھے والد نے جج صاحب سے کہا۔ میرے تینوں بچے اڑ گئے ہیں، میں اور میری بیوی تنہا رہ گئے ہیں ان کی بیویوں کو یہ ڈر ہے کہ ہم ان سے اپنے بیٹے نہ چھین لیں۔ اور یہ کہ میں چاہتا ہوں میرا بڑا بیٹا یا سارا اپنا بیٹا اور دوسرا بیٹا مجھے اپنی بیٹی دے دیں بذریعہ عدالت تاکہ یہ لوگ بچوں کی جدائی کا درد جان سکیں۔ عدالت میں موت جیسی خاموشی چھا گئی۔ بچے باپ کے پاس دوڑے آئے اور گلے لگ گئے۔ باپ نے مقدمہ واپس لے لیا۔ یہ کہانی پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ثمینہ معمولی واقعات کو غیر معمولی بنا دیتی ہے۔ جتنی بھی کہانیاں ہیں۔ ان کے کردار جیتے جاگتے ہیں۔ جو کوئی اہم کردار سامنے آتا ہے وہ اسے اپنی کہانی کا موضوع بنا لیتی ہے۔ ثمینہ اپنے دردمند دل، تحریروں اور اخلاق کی وجہ سے ادب میں اپنا مقام بہت جلد بنا چکی ہے۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں سے قاری کو آگاہ کرتی ہے۔ معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کی برداشت سے باہر ہے وہ اپنی گھٹن مٹانے کے لیے اپنی کہانیوں میں ان مسائل کی عمدہ ترجمانی کرتی ہے۔ ان کے اس کی کتاب میں اور بھی بہت سے اچھے افسانے ہیں جو مجھے پسند آئے ان کے نام لکھ دیتی ہوں۔

میں طاہرہ
کہانی سفر میں ہے
جنت دو قدم پر
معافی نہیں مل سکتی
ہاتھ میرے خالی ہیں

ثمینہ کا ایک خاص سٹائل ہے۔ منفرد انداز، سوچ اور مشاہدہ ہے۔ ان کی تحریر میں بے ساختگی اور قدرتی پن ہے۔ اس نے اپنی کہانیوں میں جن موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے وہ قابل داد ہے۔ طرز تحریر دل چسپ ہے۔ ان کی کتاب قاری سے اپنا آپ پڑھاتی ہے اسے گرفت میں رکھتی ہے۔ وہ ادھر ادھر نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے تو پھر کہنا پڑتا ہے کہ کہانی تو سفر میں ہے اور یہ زندگی بھی سفر میں ہے۔ ابھی زندگی کے اس سفر میں ثمینہ نے بہت اچھی اچھی کتابیں لکھنی ہیں۔ ثمینہ نے کہانیوں کا جو یہ چھوٹا سا پودا لگایا تھا اب وہ تناور درخت بن چکا ہے۔ اور چھاؤں بھی دینے لگا ہے۔ بہت سے لوگ اس کی کہانیوں کو پڑھ کر مستفید ہوتے ہیں۔ میری دعا ہے۔ کہ اپنی تحریر کے ذریعے وہ خوب پھلے پھولے۔ آمین

☆☆☆☆☆

یزدانی جالندھری کی نعت نگاری

اس وقت مجھے ایک ایک مبارک مگر مشکل مرحلہ درپیش ہے۔ مبارک اس سبب سے کہ موضوع حضور خاتمی مرتبت، رحمۃ اللعالمین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بابرکت مدح وثنا کا ہے اور مشکل اس وجہ سے کہ لکھنا مجھے یزدانی جالندھری صاحب کی نعت گوئی پر کے حوالہ سے ہے۔ یزدانی صاحب میرے والدِ گرامی بھی ہیں اور استاد بھی۔ تو یہ محبت بھرے رشتے کہیں مجھے عدم انصاف کے راستے پر نہ ڈال دیں۔ تو احتیاط لازم ٹھہری۔ میں کوشش کروں گا کہ یادیں تو اپنے قرطاس ذہن سے نقل کرتا جاوں اور فنی آرا اور تجزیات معتبر ادبا اور ناقدین کی تحریروں سے مقتبس کرتا جاوں۔

سوچتا ہوں کہ یزدانی صاحب کی نعت گوئی کے اوصاف وخصائص قلم بند کرنے سے پہلے کیوں نہ اختصار سے ان کا تعارف کروادوں؟

والد صاحب قبلہ یزدانی جالندھری صاحب کا مکمل نام کنیت کے ساتھ یوں ہے۔

ابو بشیر سیّد عبدالرشید یزدانی جالندھری اور ان کی ولادت 15 رمضان المبارک سن تیرہ سو چونتیس ہجری اتوار کے روز ہوئی جب شمسی تاریخ تھی سولہ جولائی انیس سو پندرہ۔ ولادت ان کی پنجاب کے ادب خیز شہر جالندھر کے گیلانی سادات گھرانے میں ہوئی۔ والد کا نام سیّد بہاول شاہ گیلانی تھا جبکہ والدہ صاحبہ کا اسمِ گرامی سیّدہ جنّت بی بی تھا۔ یہ دونوں محکمہ تعلیم میں ملازم تھے اور سکول میں پڑھاتے تھے یعنی مدرّس تھے۔ یزدانی صاحب نے ابتدائی تعلیم جالندھر ہی میں حاصل کی۔ مگر تقسیمِ برصغیر سے پہلے ہی ان کا خاندان منٹگمری (ساہیوال) منتقل ہو گیا اور یزدانی صاحب وہاں سے مزید تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور آ گئے جہاں حمید نظامی، نسیم حجازی، ضمیر جعفری اور مرزا ادیب جیسے صحافی اور ادیب ان کے ہم جماعت ہوئے۔

حامد یزدانی

جہاں تک شاعری سے شغف کا تعلق ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ شعر گوئی کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ ان کے گھر علمی و ادبی جرائد کی بھی کمی نہ تھی۔ والدین فارسی زبان وادب کے ماہر اور رسیا تھے اور پھر رشتے میں یزدانی صاحب کے ایک چچا سیّد فرزند علی شاہ صاحب بھی جو صادق ہائی سکول بہاول پور میں مدرّس تھے باقاعدہ شاعری کرتے تھے۔ غالباً وہی ابتداً اس بچے کے ادبی شوق اور شعری زوق کو مہمیز کرنے والے تھے۔

کچھ بڑے ہوئے تو شاہنامہ اسلام اور پاکستان ترانے کے خالق ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب سے تعارف ہوگیا۔ باقاعدہ اصلاحِ سخن کے لیے انھوں نے اس دور کے استاد شاعر علامہ تاجور نجیب آبادی صاحب سے جو دیال سنگھ کالج لاہور میں پروفیسر تھے ان کی طرف رجوع کیا اور ان کے انتقال کے بعد کراچی میں مقیم سلسلۂ مصحفی کے استاد شاعر مولانا افسر صدیقی امروہوی سے مشورہ سخن فرماتے رہے۔

شاعری کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور عالمی اور علاقائی ادبی تخلیقات کے تراجم بھی کیے۔ حصولِ معاش کے لیے بمبئی، کراچی اور لاہور کی فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے اور صحافت بھی کی مگر ان کی تخلیقی توجہ اور دل چسپی کا مرکز شاعری ہی رہا اور شاعری میں بھی غزل کی صنف ان کو تادیر زیادہ مرغوب رہی حالاں کہ انھوں نے لگ بھگ ہر صنفِ شعری میں طبع آزمائی کی۔

ان کا اوّلین شعری مجموعہ ''ساغرِ انقلاب'' انیس سو تیس میں شائع ہوا جو رباعیات پر مشتمل تھا۔ اس مجموعہ میں بھی چند رباعیات نعت کا رنگ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں مگر نعت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب ان کا زیادہ رجحان ستر کی دہائی کے اوائل میں ہوا۔

یزدانی صاحب امام بوصیریؒ کا قصیدہ بردہ، مولانا روم کی مثنوی، شیخ سعدی شیرازی، مولانا جامی، محسن کاکوروی، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان رضا، امیر مینائی، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، حفیظ جالندھری اور ماہر القادری جیسے شعرا کا کلام بہت شوق سے پڑھتے۔ وہ وقتاً فوقتاً ثنائے خواجہ گیہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رقم بھی کرتے رہتے تھے تاہم ان کی نعت گوئی کو تسلسل و تواتر ستر کی دہائی کے اوائل میں عطا ہوا۔ ہوا یہ کہ ان دنوں یزدانی صاحب کو ریڈیو پاکستان سے ایک نعتیہ مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ انھوں نے تازہ نعت کہی مکرم آقائے نامدار کی نذر گزاردی۔

نعت کچھ اِس طرح تھی:

اسلوبِ حمد ، نعتِ پیغمبر کا فن ملے
درویش بے نوا کو بھی اذنِ سخن ملے
اُمّی لقب سا کوئی اتالیق اب کہاں
رفتار کائنات میں جس کا چلن ملے

بطحے کی خاک پاک سے یزدانی حزیں
مجھ کو بھی آفتاب پنجتن ملے

.....

سبحان اللہ --- کیسی قبولیت کی گھڑی تھی وہ کہ جس کے بعد ان کا قلم تاعمر ثنائے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے وقف ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے مختصر نعتیں کہیں، طویل نعتیہ قصیدے لکھے اور ایک دلآویز نعتیہ مثنوی سعادت ''بعنوان'' صبح سعادت'' تخلیق کی۔ ادبی جرائد میں باقاعدگی سے ان کا نعتیہ کلام شائع ہوتا رہا اور لاہور کیا لاہور سے باہر سے بھی نعتیہ محافل میں شرکت کی دعوتیں ملنے لگیں - ریڈیو، ٹی وی کے مشاعرے ہوں یا مقامی ادبی تنظیموں کی نعتیہ محافل لاہور کے سبھی اہم شعرا ان میں شریک ہوتے۔

میں بات کر رہا ہوں ستر کی دہائی کے اواخر اور اسی کی دہائی کے اوائل کی جب پاکستان بھر میں شہر شہر اور قصبہ قصبہ نعتیہ محافل کا انعقاد باقاعدگی سے ہونے لگا تھا۔

والد صاحب یزدانی محترم کے ساتھ مجھے جن نعتیہ مشاعروں میں شرکت کے مواقع ملے ان میں کیسے کیسے عمدہ اور نفیس شعرا کو دیکھنے اور سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ چند نام دیکھیے۔ حفیظ جالندھری، احسان دانش، عبدالعزیز خالد، یزدانی جالندھری، نظیر لدھیانوی، حفیظ تائب، ذوقی مظفر نگری، علیم ناصری، خالد بزمی، عابد نظامی، حافظ امرتسری، عارف عبدالمتین، حافظ لدھیانوی، طفیل ہوشیار پوری، انجم رومانی، شہرت بخاری، ایف۔ ڈی۔ گوہر، شرقی بن شائق، تبسم رضوانی، جعفر بلوچ، حفیظ الرحمٰن احسن، تحسین فراقی، راجا رشید محمود، منیر قصوری، نقش ہاشمی، راز کاشمیری، خالد علیم، یعقوب پرواز اور کتنے ہی دوسرے خوب صورت شعرا۔

یزدانی صاحب ادبی دنیا کی غیر متنازع شخصیت تھے۔ کبھی کسی گروہ بندی کا حصہ نہیں رہے اور ہر طبقے سے عزت و احترام ہی حاصل کیا۔ ان کے شخصی کردار اور ادبی کارناموں کا اعتراف 23 مارچ انیس سو نوے)25 شعبان سن چودہ سو دس۔ بروز جمعۃ المبارک (میں لاہور میں ان کے انتقال پر بھی ہوا اور ان کی زندگی میں بھی۔ ممتاز نقاد ڈاکٹر وحید قریشی صاحب جنھوں نے یزدانی جالندھری صاحب کو ان کے شعری مجموعہ ''تورات دل'' کے دیباچہ میں'' ہمارے عہد کا استاد شاعر'' کہہ کر مخاطب کیا تھا ان کی وفات پر لکھا تھا: ''آج اردو کی جدید کلاسیکی روایت کا آخری شاعر رخصت ہو گیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب یزدانی جالندھری صاحب کو' ہمارے عہد کا قادر الکلام شاعر'' کہہ کر یاد کرتے۔

یزدانی کے دیرینہ دوست میرزا ادیب نے اپنے دوست کو ایک سچا درویش تخلیق کار اور مخلص دوست قرار دیا تھا۔

منیر نیازی نے لکھا تھا کہ یزدانی صاحب کا

نام ان چند شخصیات میں شامل ہے جن سے وہ متاثر ہوئے۔

اس موقع پر جن اہلِ نظر نے ایک بار پھر یزدانی صاحب کی نعت گوئی کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ان میں جناب حفیظ تائب کا نام بہت نمایاں ہے۔ تائب صاحب نے یزدانی صاحب کے نعتیہ مجموعہ ''توصیف'' کا دیباچہ بھی بہت محبت سے تحریر کیا تھا جس میں ان کا کہنا تھا:

حضرت یزدانی جالندھری کی نعت کا سب سے اہم موضوع اسوۂ حسنہ ہے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال و کمال کو شاعر نے کئی پہلوؤں سے دیکھا ہے اور انھیں منفرد جمالیاتی پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ بیتِ ارقم سے گنبدِ خضریٰ تک نبوت کے ماہ و سال اور شب و روز کے مشاغل کا تذکرہ جمیل کرتے ہوئے حضرتِ یزدانی نے جو والہانہ مگر مودبانہ انداز اختیار کیا ہے وہ انھیں نعت میں بہت ممتاز کر دیتا ہے۔ ان کی نعت میں امتیازات و معجزاتِ رسالت کا ذکر بھی غایت درجہ بے ساختگی سے ہوا ہے۔۔۔ انھوں نے حضور علیہ السلام کے پیرایہ حیات کے ساتھ ساتھ آپ کی تعلیمات کو بھی نعت میں سمو لیا ہے:

چند مثالیں دیکھیے

تبلیغ دیں میں آپ کا ہر دن ہوا تمام
سجدہ گزاریوں میں گزاری تمام رات

.....

مرے آقا کے ہونٹوں پر تبسم ہے، دعائیں ہیں
ادھر پتھر برستے ہیں ادھر خنجر چمکتے ہیں

.....

افشاں ہے تصور میں اس طرح جمال ان کا
ہو سامنے نظروں کے قرآن کھلا جیسے

.....

جس جگہ اُترا تھا آکر کاروانِ آگہی
یاد آیا دارِ ارقم سبز گنبد دیکھ کر

.....

انساں کو عظمتوں کی خبر آپ سے ملی
ہر بے نوا کو جینے کا حق آپ سے ملا

.....

حضرت یزدانی کی نعت کا دوسرا بڑا موضوع حاضری و حضوری ہے۔ حسرتِ حضوری اور التماسِ حضوری کے ساتھ کیفیات: حضوری کا بیان ایک معجزۂ فن ہے۔ حرمِ پاک کا ادب بھی ان کا محبوب موضوع ہے۔ فرماتے ہیں:

ہے آرزو کہ طیبہ کو جس آن جایئے
ساتھ اپنے لے کے نعت کا دیوان جایئے

.....

دیارِ طیبہ کا آیا ہی تھا خیال ابھی
بکھر گئے اُفق ذہن پر اجالے سے

.....

زائرانِ حرم پاک یہ ہے شرطِ ادب
سر ہی تنہا نہ جھکے دل بھی جھکائے رکھنا

.....

رات بھر تھا گنبدِ خضریٰ کا منظر سامنے
دیدنی تھی روح کی بے اختیاری رات بھر

سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلقِ عظیم کے ذکرِ جمیل کے ساتھ ساتھ حضرت یزدانی کی نظر امت کے احوال پر بھی پڑتی ہے اور عالمِ اسلام کی ابتلا اور عصری آشوب بھی ان کی نعت کے اہم موضوع بن کر سامنے آتے ہیں۔ یوں ان کی نعت اپنے زمانے کا آئینہ :بن گئی ہے۔ وہ آشوبِ امت وانسانیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں:

اے لات و مات اور ہبل توڑنے والے
امت نے تری آج تراشے ہیں صنم اور

سنت کے ہیں پیرا نہ ہیں قرآں کے عامل
اب فکر ونظر اور ہیں ، دل اور حرم اور

.....

ذہن وفکر عصرِ حاضر بے طرح بیمار ہے
اِس کو پھر آب وہوائے بابِ رحمت چاہیے

.....

حضور ، اک نگہِ لطف پھر سے امت پر
کہ لے رہی ہے بہت دیر سے سنبھالے سے

جنابِ حفیظ تائب آگے چل کر لکھتے ہیں:

حضرتِ یزدانی قرآن وسنت پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔

تائب صاحب کی اس بات کی مشاہداتی تائید میں بھی کروں گا کیونکہ میں نے والد صاحب کو قرآن پاک اور احادیث کی کتب کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ قرآن و حدیث ہی نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنیادی مآخذ ہیں۔

واپس تائب صاحب کی رائے کی جانب آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

حضرتِ یزدانی کی جولانی طبع میں بلا کی روانی ہے۔ ان کی روح کی آواز ہے۔ ان کی زندگی اس بات کا آئینہ ہے کہ وہ کبھی تشکیک کی زد میں نہیں آئے۔ غارِ حرا سے ابھرنے والی صداقت پر ان کا ایمان پختہ تھا۔ بعض مقامات پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یزدانی کے ساتھ الفاظ بھی مصروفِ عبادت ہیں اور یزدانی نعت نہیں کہہ رہے اظہارِ عجز کر رہے ہیں۔ دہر کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے آقا سے روشنی مانگ رہے ہیں:

جو رہِ نجات دکھا گئی، جو طریقِ زیست سکھا گئی
تری اُس نظر کی ہے آرزو، اسی اک نظر کا سوال ہے

.....

پروفیسر عارف عبدالمتین یزدانی صاحب کی نعت گوئی پر کچھ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

بالخصوص سوادِ نعت میں انھوں (یزدانی صاحب) نے آنحضورؐ کے ساتھ اپنی جس شیفتگی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اپنی قدر و منزلت کے اعتبار سے نہایت منفرد، رفیع اور وقیع ہے۔

پروفیسر جعفر بلاچ صاحب کے الفاظ میں:

جناب یزدانی جالندھری کے نعتیہ کلام کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے وجدانی اور فکری سانچے نعت گوئی ہی کے لیے

ڈھالے گئے تھے--- جنابِ یزدانی کے یہاں زبان و بیاں کی گوناگوں لطافتیں موجود ہیں -وہ الفاظ صوری اور معنوی سمتوں سے پوری طرح آشنا ہیں اور ایک مضمون کو سوڈھنگ سے باندھنے کا سلیقہ بھی وہ خوب جانتے ہیں--- نعت کے کلاسیکی سرمائے پر بھی ان کی نظر ہے- میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان کی مثنوی سعادت ''صبحِ سعادت'' ایک تاثیر آگیں نظم ہے جس کی تعریف متعدد اکابر نقادوں نے کی ہے-

ایک سو پانچ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی جس کب ابتدا حمد رب تعالیٰ سے ہوتی ہے- تخلیقِ کائنات، تخلیق بشر اور ظہور انبیاء علیہ السلام کے ذکر سے چلتی ہوئی رسولِ مبین، خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی آمد اور اس تاریخی واقعہ کی برکات اور سلام کے دل نشیں اشعار پر پہنچ کر تکمیل یاب ہوتی ہے-

مثنوی کے ابتدائی اشعار سماعت فرمائیں:

لائق حمد و ثنا ہے اک وہ ذاتِ کبریا
مالک و مختار مطلق، خالقِ ارض و سما

.....

خاک کے پُتلے مین پھونکی اُس نے روحِ زندگی
آدمی کو اس نے بخشا نورِ علم و آگہی

.....

جعفر صاحب اپنے مضمون کے اختتام پر رقم طراز ہیں:

یوں تو یہ پوری نظم ''صبحِ سعادت''، حسنِ خیال اور حسنِ اظہار کا مرقع ہے جو دل و نظر کو مسحور کرتا ہے لیکن نظم کے آخر میں جو سلام جنابِ یزدانی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا ہے وہ خصوصیات سے قابلِ ذکر ہے- جناب یزدانی نے یہ سلام عقیدت و ارادت کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ بارگاہِ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پیش کیا ہے- جذبات کے گداز، اور لفظیات کے حسنِ انتخاب نے اس سلام کو اردو کے زندۂ جاوید سلاموں کا اہم ورق بنا دیا ہے- اس دل آویز اور جاں افروز سلام کے چند اشعار آپ کی نذر ہیں:

الصلوٰۃ والسلام اے مہبطِ روح الامیں
الصلوٰۃ والسلام اے رحمۃ اللعالمیں

الصلوٰۃ والسلام اے تاجدارِ کل اتقی
الصلوٰۃ والسلام اے افتخارِ انبیا

الصلوٰۃ والسلام اے مایۂ بے مایگاں
الصلوٰۃ والسلام اے رحمتوں کے سائباں

السلام اے نور، یزداں، الصلوٰۃ والسلام
آفتابِ صبحِ ایماں، الصلوٰۃ والسلام

.....

میں یزدانی جالندھری صاحب کے سلام کے انھی خوب صورت اشعار پر ہی اپنے مضمون کا اختتام کرنا چاہوں گا-

☆☆☆☆☆

آنکھ سے آسمان جاتا ہے..... طارق نعیم

اردو شاعری خاص طور پر غزل کو نیا رنگ اور مزاج عطا کرنے میں ہمارے شاعروں کی بے شمار کاوشیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جدیدیت کے نام پر ہونے والے تجربوں نے غزل کی خوبصورتی کو مسخ بھی کیا ہے۔ لیکن وہ شاعر قابل ستائش ہیں، جنھوں نے جدید غزل کہتے ہوئے روایت کی پاسداری کی ہے۔ انھی شاعروں میں ایک معتبر نام جناب طارق نعیم کا بھی ہے۔ جن کی نعت کے ایک شعر نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے--- آپ بھی پڑھیں:

میں اپنے آپ کو اونچا سمجھنے لگتا ہوں
اگر مدینے سے اک بھی کھجور آ جائے

.....

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت اور عقیدت و احترام کا یہ ایک الگ انداز ہے۔ اسی طرح کی منفرد اور قابلِ غور شاعری ان کی کلیات میں بھی شامل ہے۔ انھوں نے کلیات کا نام اپنے اس شعر سے اخذ کیا ہے---

آنکھ سے آسمان جاتا ہے
میں توجہ ہٹا نہیں سکتا

.....

اس کلیات میں ان کے مختلف ادوار میں شائع شدہ تین مجموعے، وقت کا انتظار کون کرے، دیے میں جلتی رات اور رکی ہوئی شاموں کی راہداریاں شامل ہیں۔ طارق نعیم اپنی شاعری میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس موضوعات کی فراوانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حرف کو اس کی اصل جگہ پر برتنے کے ہنر سے بھی آشنا ہیں۔ ان کی تخلیقی ہنرمندی، مشاہدے، تجربے اور طویل ریاضت نے انھیں دنیائے ادب میں ایک مقام عطا کر رکھا ہے۔ بقول سید مجتبیٰ حیدر شیرازی، اس کے ہاں لفظ سے اور نہ ہی خیال سے زور زبردستی ہے بلکہ وہ مضمون کو لفظوں میں اٹھنا بیٹھنا سکھاتا دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس نے کسی لفظ گیر فقیر سے ایک

محمد نوید مرزا

ریاضت کے بعد لفظوں سے بزم آرائی کا
ہنر سیکھ رکھا ہے،،
ان الفاظ کی صداقت کو سمجھنے کے لئے آیئے
اب طارق نعیم کے کچھ شعر دیکھتے ہیں---
دل کے دریا میں کچھ اس طرح روانی آجائے
کربلا ہونٹ پہ ہو آنکھ میں پانی آ جائے

.....

کاش ایسا ہو مدینے وہ بلائیں جب بھی
ان کے روضے پہ مجھے بات بنانی آ جائے

.....

میں کائنات سے پہلے جہاں جہاں گیا تھا
مرے علاوہ کوئی اور بھی وہاں گیا تھا

.....

پھر اس سے قبل کہ بار دگر بنایا جائے
یہ آئنہ ہے اسے دیکھ کر بنایا جائے

.....

میں نے قرطاس پہ لا کر انہیں پابند کیا
لفظ اظہار میں کب حاشیہ پوش آئے تھے

.....

جشن موقوف کر دیا جائے
شہر میں ایک حادثہ ہوا ہے

.....

اک فاصلہ رکھ ہے ہمیں اور دنوں تک
یہ وقت کہیں ملنے ملانے کا نہیں ہے

.....

یہ کائنات صراحی تھی جام آنکھیں تھیں
مواصلات کا پہلا نظام آنکھیں تھیں

.....

یہ اور اس کے علاوہ بھی کئی شعر کلیات کا حصہ ہیں- اپنے طویل دیباچے میں انجم خلیق نے انہیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا ہے، ایک اقتباس دیکھیں---

--- فلک پیمائی کے علاوہ حیرت وہ دوسرا عنصر، کیفیت یا سوچ ہے، جس کے ریشم سے طارق نعیم اپنے شعری جمالیات کے تار و پود کی بخیہ گری کرتا ہے- اس کی حیرت شاعری اسے مایوس نہیں کرتی، سوال اٹھاتی ہے- وہ قاری کو حیرت زدگی کے طلسم میں الجھاتا تو ہے مگر جوں جوں قاری پر معنی کی پرتیں کھلتی ہیں تو اس کا ذوق شعر، شاعر کی انفرادیت فکر اور علوئے معنی سے سرشار ہو جاتا ہے،،

طارق نعیم خود بھی حیرت میں گم ہیں اور ہمیں بھی اس حیرانی کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں- وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں ---- میری شاعری میرے لیے صحرا بھی ہے حیرت بھی اور گمان بھی ہے- اس لیے بھی کہ میرے شعری وجدان کا سلسلہ اس رات سے جڑا ہوا ہے جو سر شام ہی ان دیئوں کی گنتی شروع کر دیتی ہے جنھیں اس نے اپنی ذات کے اندھیرے میں صبح ہونے سے پہلے شکار کرنا ہوتا ہے،،

ناقدین کی کمی کے اس دور میں خود کو دریافت کرنے کی یہ عمدہ کاوش ہے- طارق نعیم کو بہت بہت مبارک باد--- ویل ڈن

☆☆☆☆☆

''شاید نہیں''.....افسانہ نگار: رفیع حیدر انجم.....خود کلامی کہانی سنا رہی ہے

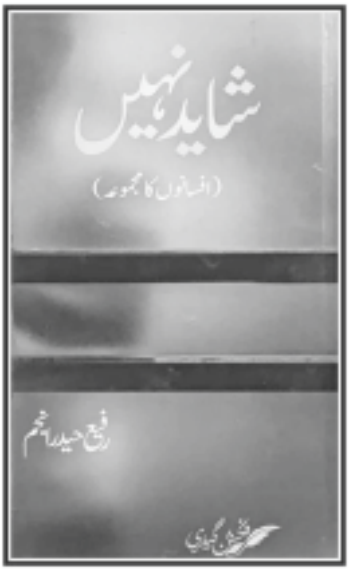

کائنات کا وجود میں آنا اور اس کے اندر فنا کا راز رکھ کر زندگی کو تجسس میں رکھنا کہانی ہے۔ کب کیا ہوگا، کی سوچ کہانیوں کو جنم دیتی ہے، تحیر اور وسعت سے ہمرکاب کرتی ہے۔ اپنے اطراف سے ایسی ہی ڈھیروں المیہ، طربیہ اور تجسس سے معمور کہانیاں ہم کہانی کار اپنے مزاج کے سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ دو چار کہانیاں مصنف کا اسلوب بتا دیتی ہیں۔ کہانی کار بیانیہ انداز اپناتا ہے لیکن کچھ کہانی کار کہانی کرداروں کے حوالے کر کے خود پیچھے رہتے ہیں جبکہ کچھ افسانہ نگاروں کے ہاں مکالمہ چلتا رہتا ہے۔ کہانی میں مصنف خود کلامی کے ذریعے معاشرے میں جا بجا بکھری کہانیاں رقم کرتا رہتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے وہ قاری کے ساتھ ساتھ حقائق لے کر چل رہا ہے۔ اپنی آنکھوں سے قاری کو کائنات کے کریہہ مناظر دکھا رہا ہے۔ ایسا ہی تخلیق کار ہے رفیع حیدر انجم۔ رفیع حیدر انجم کا تعلق بھارت سے ہے۔ ان کی کتاب ''شاید نہیں'' جس میں چھبیس افسانے اور پانچ افسانچے شامل ہیں۔ اس دیدہ زیب کتاب کی اشاعت ''فکشن گیلری'' پبلی کیشنز نے لاہور سے کی ہے۔ سچ کہتے ہیں عشق اور ادب کی حد ہوتی ہے نہ سرحد۔

الفاظ ایک احساس تخلیق کرتے ہیں اور احساس کی روانی کو قید نہیں کیا جا سکتا البتہ قلم بند ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اسے کہانیاں، افسانے اور شاعری کے قالبوں میں ضرور ڈھالا جا سکتا ہے۔ پھر یہ خوشبو نگر نگر دھنک رنگ کرتی پھرتی ہے۔

لکھنے والا دنیا کو جس تحیر سے دیکھتا ہے وہی حیرت کہانی کو جادوئی موڑ اور دلکش پیرائے

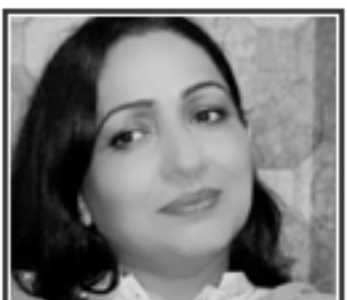

ثمینہ سید

عطا کرتی ہے۔

ہمارے نہایت محترم اور معروف نقاد جناب جمیل احمد عدیل ''شاید نہیں'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شاید نہیں'' سے موسوم اس مجموعے میں عمومی روایت کے مطابق بھلے ہی ٹائٹل سٹوری بھی موجود ہے لیکن اس مرکزی سرنامے کو اپنی تمام کہانیوں کا ترجمان بنانا اس لیے بھایا کہ مصنف نے اس، مقبول تیقن، سے عمداً فاصلہ اختیار کیا ہے جس نے سوچ سمجھ کر واحد تعبیر کی حکمرانی کے لیے سدا راہ ہموار کی۔ ظاہر ہے جنہیں زعم خوب راس آیا ہو، وہ بھلا ادعا ایسے'' اعلا جوہر'' سے کب دستبردار ہونے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ یوں ذہن اسی طرح بنا دیے گئے ہیں، جسے اپنے کہے پر کامل ایقان حاصل نہیں، جس کے وجود کا پیمانہ خود اعتمادی کی مے سے چھلک نہیں رہا؛ اسے کوئی بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوگا جی ایسا ہی ہے مگر کیا اس طرف پر مرکوز ہونے کی احتیاج نہ تھی کہ واحد متکلم کے بس کا تریاق بھی واحد متکلم ہونا ایسا بھید تو نہیں! اس عملی کلیے کے تحت شد و مد کے ساتھ پیش ہونے والا ہر بیانیہ اسی شد و مد کے ساتھ استرداد کا شکار ہوا۔ یوں ذہنی جارحیتوں کے باعث سماج علمی اناؤں سے تنگ و تنگ بھر گیا سو سچی بات ہے'' شاید نہیں'' کی نرم دستک نے اس تخلیقیت کا خاموشی سے اثبات کرا لیا ہے جسے اس نے کسی نہ کسی سطح پر لادریت سے وصول کیا ہوگا۔''

''شاید نہیں'' یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے افسانے خود کلامی ہیں۔ مصنف جیسے خود سے مکالمہ کر رہا ہو۔ اکثر کہانیاں ایسی ہیں جن میں وہ خود نظر آتا ہے اور وہ اپنی نجی زندگی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ بیوی سے مخاطب بھی ہوتا ہے اور اس کے نرم لطیف پہلو میں چھپنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ کیونکہ مصنف مسلسل الجھن کا شکار ہے۔ اسے معاشرے کے گرگٹ کی طرح بدلتے رنگ اور رویے ششدر رکھتے ہیں۔ لکھتا ہے۔

''صبح آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر قد آدم آئینے پر پڑی۔ اپنا سراپا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی پریشان خیالی پر سخت شرمندگی ہوئی کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ خواہ مخواہ ہی میں رات بھر شکوک و شبہات کی تیرگی میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ میرے چہرے پر تمانیت کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔''

''میں محسوس کرتا ہوں کہ اس اپاہج آدمی میں غیر معمولی دلچسپی پر بس کے مسافر مجھے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کے چہروں پر ناخوشگواری کی لکیریں بھی واضح ہونے لگی ہیں۔ اچانک میں خود کو خوفناک درندوں کے درمیان گھرا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ شاید لوگ مجھے اٹھا کر اس کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دینے کا ارادہ کر رہے ہیں۔''

''ہمیشہ دائروں میں رہنا اچھا نہیں لگتا بلکہ میں تو دائروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن ------ وہ خاموش ہو جاتا ہے کہ اس لیکن کے بعد خاموشی ہی دور تک ساتھ دے سکتی ہے۔ پھر وہ مسکرانے لگتا ہے۔اس کی مسکراہٹ میں اپنائیت کا گہرا رنگ جھلکنے لگا ہے۔''

''اور پھر اس کی ماں کی کہانیوں کی روکھی سوکھی روٹیاں اس کے کمرے کے کونوں کھدروں سے نکل نکل کر اسے آ دبوچتی ہیں۔''

''ادھورا آدمی'' افسانے میں لکھتے ہیں:

''اس کی سیاہ آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہے - میں نہیں جانتا یہ کس مذہب اور عقیدے سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کے لمبے لمبے کانوں اور ستواں ناک کی سانولی رنگت دیوتاؤں کے سے تقدس کی مظہر ہے۔ تو کیا اس اپاہج آدمی کو احساس ہے کہ اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات ہے۔''

''شاید --- شا---- تمہارا جسم بھی ایک فریب رنگ، شاید، ہے۔ سرنگ جیسی تنگ و تاریک اور شہر کی طرح کر فیوزدہ''

مذہبی دنگے فساد اور عام زندگی کی مشکلات بھی ان افسانوں میں نوحہ کناں ہیں لیکن علامت کے مہین پردوں میں لپٹی ہوئی ہیں یہی ان افسانوں کا حسن ہے۔

''ہیرامن کی چوتھی قسم'' میں ہیرامن اور لال موہر مرکزی کردار ہیں۔ یہ ایک طویل لیکن دلچسپ موڑ لیتی کہانی ہے جو قدم قدم پر حیران کرتی ہے۔اس کے باوجود مبالغہ یا غیر فطری ماحول کہیں نہیں ہے۔

''کھنڈروں میں بسے ہوئے لوگ'' روایتوں اور جدتوں کے تال میل کی کہانی ہے جو اب خوف کی لہر بن کر ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کر جاتے ہیں جس جدیدیت کو روایت زدہ لوگ ماننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔

''آوازیں، لفٹ کا تبادلہ، بھوک کی رفتار، کاش ،گے'' بہترین افسانچے ہیں اور آخر میں عالمی شہرت کے حامل افسانہ پیج ''عالمی افسانہ میلہ'' کے دوستوں کی آرا ایک نئی اور خوب صورت روایت کا آغاز ہے - یہ کتاب میں پنجاب یونیورسٹی کے کتاب میلہ سے خرید کر لائی تھی کیونکہ میں نے بھی عالمی افسانہ میلہ پر رفیع صاحب کے افسانے پڑھ رکھے تھے۔ میں اب پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔

مجموعی طور پر اس کتاب ''شاید نہیں'' کے افسانے مختلف رنگوں اور ذائقوں کے افسانے ہیں جو روزمرہ زندگی کے گلی کوچوں میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ جناب رفیع حیدر انجم نے ان افسانوں کو محبت سے اپنے ہاتھوں کی اوک بنا کر دامن میں بھر لیا ہے یہ یوں چمک اٹھے ہیں جیسے ستارے افق کو جگمگ کر دیتے ہیں۔ دعا ہے کہ رفیع حیدر انجم کی یہ کتاب ان کے ادبی افق پر روشن ستارا بنی چمکتی رہے اور مزید تخلیقات کے لیے سنگ میل ثابت ہو۔ آمین

☆☆☆☆☆

ریاض ندیم نیازی کے بہترین مضامین

گزشتہ دنوں بہ ذریعہ ڈاک سرزمین سبی بلوچستان سے ممتاز شاعر و ادیب اور کتبِ کثیرہ کے مصنف فاضل دوست ریاض ندیم نیازی کے انتہائی خوب صورت مضامین کے مجموعے ''دل معمور عقیدت سے'' اور ''نقدِ ہنر'' کتابی شکل میں موصول ہوئے جس پر میں اِن کا شکر گزار ہوں۔

ریاض ندیم نیازی کی دونوں کتابیں انتہائی خوب صورت جلد، معیاری پرنٹنگ اور جاذب نظر ٹائٹل کے ساتھ علمی و ادبی چاشنی سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی اشاعت پر ریاض ندیم نیازی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتابوں کے مطالعے سے ایک اضافی خوشی بھی ہوئی کہ کتاب ''نقدِ ہنر'' کے صفحہ نمبر ۱۸ پر میرے شہر کے ممتاز شاعر، ادیب، مقرر، بدیکار، تنقید نگار اور درجنوں کتب کے خالق اکرم کنجاہی پر یہ عنوان ''فنِ اختصار نویسی'' کے حوالے سے مضمون بھی شامل ہے جو میرے اور میرے شہر کے لیے عزت و تکریم کے مترادف ہے۔

ریاض ندیم نیازی صوبہ بلوچستان کے خطہ سبی متحرک لکھاری ہے جو کچھ نہ کچھ لکھنے کا جذبہ ہمہ وقت رکھتا ہے وہ اس وقت ملک بھر میں علمی و ادبی حلقوں کی پہچان ہیں اور محفلوں کی زینت بنتے ہیں۔ صدارتی سیرت ایوارڈ سے لے کر اَن گنت اعزازات وصول کر چکے ہیں۔ ''دل معمور عقیدت سے'' اور ''نقدِ ہنر'' نیازی صاحب کے مضامین کے وہ مجموعے ہیں جو انھوں نے گاہے بہ گاہے اپنے دوستوں کی

احسان فیصل کنجاہی

کتابوں میں، دیباچے، فلیپ، تبصرے یا اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اِن سب کو یک جا کر کے انھوں نے دو کتابیں اپنے قارئین اور چاہنے والوں کی خدمت میں پیش کی ہیں۔
ریاض ندیم نیازی بڑی سچائی، لگن اور محنت سے شاعری و نثر نگاری، تنقید نگاری، شخصیت نگاری اور ادبی رسائل پر جاں کاری کے لیے ہمیشہ حوصلہ افزائی اور محبتوں سے مزین قلم کے ذریعے طبع آزائی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ادب کے قارئین کو ان کی کتابوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ چوں کہ ان کے مضامین میں عام فہم اسلوب کے ساتھ مختلف موضوعات کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔
ریاض ندیم نیازی اپنے قاری کو اپنا مطمع نظر سمجھانے میں کام یاب دکھائی دیتا ہے۔
ریاض ندیم نیازی فروغ علم و ادب میں جس تیزی سے اپنا مثبت کردار ادا کر رہا ہے یقیناً ادب کے ناقدین اور قارئین اسے کبھی فراموش نہیں کریں گے۔
ان کتابوں کی اشاعت سے اب یہ حقیقت بھی محتاجِ ثبوت نہیں رہی کہ ریاض ندیم نیازی صفِ اوّل کے ہمہ جہت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ درجۂ اوّل کے نثر نگار بھی ہیں۔ جس طرح انھوں نے شعر گوئی میں اپنے معاصرین کے لیے تازہ معیارات قائم کیے ہیں اسی طرح اپنی جان دار نثر کے ذریعے وہ معاصر ادیبوں کے لیے ایک قابلِ تقلید اور لائقِ رشک مثال بن کر ابھرے ہیں اُن کے مضامین ندرتِ بیان کے علاوہ ندرتِ فکر کے بھی حامل ہیں۔ اُمید کی جا سکتی ہے کہ تنقید و تحقیق کے میدان میں اُن کا سفر جاری رہے گا۔
ریاض ندیم نیازی کے مضامین کی یہ دونوں کتابیں ملک بھر کی لائبریریوں کی زینت بنی چاہئیں، ماورا پبلشرز بھی خراجِ تحسین کا مستحق ہے کہ جنھوں نے خوب صورت لکھاری کی خوب صورت کتابوں کو ان کی پہلی کتابوں کی طرح شایع کر کے اپنا علمی و ادبی فریضہ سرانجام دیا ہے۔ میرے خیال میں ریاض ندیم نیازی اپنی پہلی تخلیقات کی طرح اس دفعہ بھی اپنی شہرت اور عزت و تکریم میں اضافے کا سبب بنیں گے البتہ ”دل معمور عقیدت سے“ اور ”نقدِ ہنر“ دونوں کتابیں علمی و ادبی میدان کے شاہ کار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ریاض ندیم نیازی کو حاسدوں کی نظر سے بچائے ان کے زورِ قلم کے لیے دُعا گو ہوں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی ''مجال''

کوئی بھی جینوئن اور حقیقی شاعر اپنی ذات کو جتنے پردوں اور غلافوں میں چھپا لے مگر شاعری میں اس کی ذات اور کردار کھل کر سامنے آجاتا ہے مطلب یہ کہ ہر انسان کے اندر جو روح ہوتی ہے وہی انسان کا اصلی روپ ہوتا ہے۔ شاعری چونکہ اندرونی اور باطنی کیفیات اور احساسات سے عبارت ہے اس لیے شاعر کی اصلی شخصیت لوگوں پر بے نقاب ہو ہی جاتی ہے آج کل کے مصنوعی دور میں شاعر کا کردار اور اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ شاعری شاعر کی قلبی واردات ہوتی ہے اسی لیے وہ اپنا مشاہدہ، تجربہ اور ذات پر بیتے ہوئے حالات اور لمحات کو الفاظ کی خوبصورت ترتیب میں مقید کر لیتا ہے بالکل اسی طرح زیر نظر کتاب ''مجال'' میں ہم ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی شخصیت اور اس میں ٹھہرے ہوئے انسان کا بخوبی جائزہ اور اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ایک خوبصورت، نفیس، پاکیزہ، رنجیدہ، دکھی، نازک دل رکھنے والے، تھوڑا سے شرارتی، کبھی کٹھی اور کبھی میٹھی باتیں کرنے والے اور ایک دردمند اور پیار کرنے والی شخصیت کے روپ میں نظر آتے ہیں کیونکہ مجال میں ان کے ہر روپ اور ہر رنگ سے آشنائی اور شناسائی ہوئی ہے۔ انھوں نے زندگی سے زندگی کو تلاش کیا ہے اور اگر کوئی شخص زندگی کو پالے تو وہ بہت سے مسائل اور پیچیدگیوں سے بچ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ایک خالص تخلیقی شخصیت کے مالک ہیں اور وہ زندگی کو عام ڈگر سے بالکل ہٹ کر دیکھتے ہیں قدرت نے ان کو ایک مختلف اور

فیصل زمان چشتی

خوبصورت سوچ وفکر سے نوازا ہے انھوں نے زندگی کے حقائق کو دیکھا، پرکھا اور تسلیم کیا ہے انھوں نے اس میں موجود دکھوں، غموں اور خوشیوں کے تناسب کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں تلخی کم اور شگفتگی کا عنصر زیادہ ہے اور یہ آدھے گلاس پانی والا معاملہ ہے کسی کو بھرا ہوا تو کسی کو خالی نظر آتا ہے اور میرے خیال میں ڈاکٹر اشفاق ورک نے زندگی کے گلاس کو بھرے ہوئے والی نظر سے دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ زندگی کے مثبت پہلوؤں کی تلاش کا سرگرداں نظر آتے ہیں۔ زندگی کسی کے لیے بھی ہرگز آسان نہیں ہوتی لیکن انسان کی مثبت اپروچ اور معاملہ فہمی مسائل کو بڑی حد تک کم کر دیتی ہے اور آسانیاں ڈھونڈنا مشکل نہیں رہتا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کا نظریۂ زندگی قابل تقلید اور لائق تحسین ہے۔ جس طرح ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی نثر شگفتگی اور برجستگی کا حسین امتزاج ہوتی ہے اسی طرح ان کی شاعری بھی قوس قزح کے رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ یہ سرتاپا تخلیق کار ہیں اور ہر وقت کچھ نہ کچھ نیا کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ ان کے مزاج کا دھیما پن اور ٹھہراؤ ان کی گفتگو اور شاعری میں بھی بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ طنز و مزاح لکھنا انتہائی مشکل کام ہے مزاح لکھنے کے لیے انتہائی سنجیدگی درکار ہوتی ہے زندگی کا عمیق مشاہدہ، تلخ و شیریں تجربات جب انسانی ذات کی بھٹی کے الاؤ میں کندن بنتے ہیں تو ادب تخلیق ہوتا ہے۔

ان کی شاعری کے دو پہلو ہیں ایک سنجیدہ اور دوسرا طنز و مزاح۔ ان کی مزاحیہ شاعری روایتی مزاحیہ شاعری نہیں ہے۔ جس طرح آجکل چل رہا ہے کہ مزاح کی جگہ پھکڑ پن اور چربہ سازی۔ یہ معاشرے کے مختلف معاملات پر اس طریقے سے گہرا طنز کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ شگفتگی کا عنصر بھی سامنے آتا ہے۔ یہ زہر کے بجائے گڑ سے مارنے کے فن میں طاق ہیں۔ ان کے اشعار سننے والا بے اختیار داد و تحسین اور مسکراہٹ کا خراج دینے پر مجبور ہو جاتا ہے ''مجال'' کا ایک حصہ سنجیدہ اور ایک حصہ شگفتہ شاعری سے سجا ہوا ہے انھوں نے بڑے خوبصورت، لطیف اور ہلکے پھلکے انداز میں ہماری آنکھیں کھولنے اور گدگدانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مزاح کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں اصلاحی پہلو بھی نمایاں ہیں۔ کہیں بھی فضول اور واہیات اشعار نظر نہیں آتے۔

واقعی ایسا لگتا ہے کہ ایک معلم بہت خوبصورت اور لطیف انداز میں بات سمجھا رہا ہے۔ آجکل مزاحیہ شاعری میں بیگم اور

سسرال کا ذکر کر کے سمجھا جاتا ہے کہ حق ادا ہو گیا ہے اور بات بھی ختم ہو گئی ہے مگر ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے اس سے آگے کی بات کی ہے اور مزاح میں نیا جہان دکھایا ہے اور دیگر مزاحیہ شعرا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شاعری کے یہ معیارات ہیں۔ مثال کے طور پر وہ یہ کہتے ہیں:

دال گلتی نظر نہیں آتی
گیم چلتی نظر نہیں آتی
اپنی قسمت بھی ملک جیسی ہے
جو بدلتی نظر نہیں آتی

.....

اول ہونا چاہیے کچھ فول ہونا چاہیے
بدتمیزی کے لیے ماحول ہونا چاہیے
آگ لفظوں سے لگائی جا تو سکتی ہے مگر
آپ کا لہجہ ذرا پٹرول ہونا چاہیے
دل کمینے سے سرِعام بغاوت کرتا
کتنا دشوار ہے زوجہ سے محبت کرتا

.....

جان من میں تیری خاطر تارے توڑ کے لا سکتا ہوں
دو اور چار کی بات نہیں میں سارے توڑ کے لا سکتا ہوں
گر کوئی راہ میں حائل ہو تو نائن الیون لگ سکتی ہے
امریکہ کے اونچے محل منارے توڑ کے لا سکتا ہوں
تیری خاطر ماں پیو کی میں آنڈھ گوانڈھ سے لڑ سکتا ہوں
جیتے ممبر ایک طرف ہیں ہارے توڑ کے لا سکتا ہوں

.....

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں یہ اُستاد ہیں لکھاری ہیں شاعر ہیں کالم نگار ہیں خاکہ نگار ہیں۔ خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس ہیں انتہائی مہارت درکار ہوتی ہے کسی بھی شخصیت یا کردار کو اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ شگفتگی اور شائستگی مدنظر رہے اور تضحیک کے پہلو سے بھی بچا جائے اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب توازن رکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ یہ ایک خاکہ نگار کی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔

''مجال'' کی شاعری اس عہد کی شاعری ہے بلکہ ایک تاریخ ہے جو یہ مرتب کر رہے ہیں انھوں نے بعض جگہوں پر سنجیدگی اور بعض جگہوں پر اپنے شگفتہ پن سے معاشرے اور سماج کی داستانیں رقم کی ہیں اور یہی ایک سچے تخلیق کار اور حینوئن لکھاری کی پہچان ہوتی ہے کہ مدعا اس طرح بیان کرتا ہے کہ معاملات و مسائل کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور ذوق جمالیات بھی متاثر نہیں ہوتا۔ آج کے دور میں ایک تخلیق کار کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی مٹی سے جڑا رہے اپنے لوگوں کے ساتھ تعلق میں رہے مسائل کو پہچانے اور حق بات کہنے میں ذرا بھی تامل سے کام نہ لے بلکہ اپنے منصب کا خیال رکھتے ہوئے بے دھڑک اظہار کرے ذمہ داری کا ثبوت دے اپنے قلم

کو اپنا ہتھیار بنائے ظالم اور ظلم کا ساتھ نہ دے مظلوم کی دادرسی کے لیے بے چین رہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے بھی اپنے منصب کا حق ادا کیا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ عہد موجود میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کو ترجیحات میں رکھا جائے کیونکہ ہر دور کے اپنے تقاضے اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اس عہد پر آشوب میں اگر شاعر صرف اپنے حال میں ہی مست رہے گا۔ صرف مشاعرے پڑھنے کی تگ ودو اور پلاننگ کرتا رہے گا ادب کو کاروبار بنائے گا تو سخت بددیانتی کا مرتکب ہوگا۔ اگر ہم دنیا کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہر انقلاب اور تحریک کے پیچھے ادب اور شاعری کھڑی نظر آتی ہے۔

مجھے یہ بات کرتے ہوئے انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر اشفاق احمد صحت مند ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ انسانیت ان کی پہلی ترجیح ہے اور معاشرے کو سجانے اور سنوارنے میں اپنا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کر رہے ہیں۔

مجال میں بڑے بڑے اشعار موجود ہیں جو شعور وفہم کے زنگ اتار رہے ہیں۔ ان کے خوبصورت اور باکمال اشعار سے احساسات و جذبات کے سمندر میں مدوجذر پیدا ہونے لگتا ہے ان کی ذات کے اندر ایک نہایت متین اور سنجیدہ شخص موجود ہے جس کو آج کے حالات و واقعات کا پوری طرح ادراک ہے اور وہ اپنے فکری وجدان اور باطن میں پھوٹنے والی روشنی سے ایسے ایسے اشعار تخلیق کر رہا ہے جس سے لوگوں کے ذہنوں میں ارتعاش پیدا ہو رہا ہے اور ان کی شعوری سطح بلند ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر اشفاق ورک کی شاعری سلاست و روانی سے عبارت ہے۔ یہ سادہ سے الفاظ میں بڑی بات کہہ جانے کا ہنر جانتے ہیں۔ سہل ممتنع میں اشعار کہنا بڑے شعراء کا کام ہے۔ اور یہی بڑی شاعری بھی ہوتی ہے۔ ان کے مزاحیہ اشعار میں بھی معاشرے کے لیے دکھ اور کرب کا اظہار ملتا ہے۔ سنجیدہ شاعری میں ان کی فکری سطح بہت بلند ہے۔ ان کی شاعری میں وہ طنز اور کاٹ نظر آتی ہے جس سے مسائل کھل کر سامنے آتے ہیں اور کہیں پر بھی یہ اخلاق اور تہذیب وشائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے۔ کچھ اشعار دیکھیے:

قد آوری کے باب ہی اپنی مثال تھا
جس آدمی کو شہر کے بونوں نے جالیا

سر کٹانے کی بات کرتے ہیں
سر کو دھننے کا فن نہیں آیا

.....

سانحہ جب بھی ستاتا ہے اکہتر والا
جاگ اُٹھتا ہے وہی درد بہتر والا

کیا عجب کائنات نکلی ہے
زیست بھی واردات نکلی ہے

.....

نسلِ آدم کی جب کھدائی کی
ہر جگہ ذات پات نکلی ہے

.....

خواب زاروں میں روشنی کرنا
کتنا مشکل ہے زندگی کرنا

.....

آج کے ہاؤ ہو کے دور میں جب ہر طرف ہڑبونگ مچی ہوئی ہے ادب کے میدان میں اتنا شور ہے کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی شاعری کے نام پر بدتمیزیاں اور اخلاق باختگیاں عروج پر ہیں۔ محبت کائنات کا لطیف اور خوبصورت ترین جذبہ ہے اور پھر محبت کی شاعری اس پر کیف احساس کو دو چند کر دیتی ہے مگر محبت کی شاعری کے نام پر جو کھیل کھیلا جا رہا ہے اور اخلاقی اقدار کی جو دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں اس سے ہمارے معاشرے بالخصوص نوجوان نسل پر جو مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ انتہائی خوفناک اور تشویشناک ہیں میری اس بات کے ثبوت کے طور پر آپ کسی بھی جامعہ یا یونیورسٹی میں ہونے والے مشاعرہ میں اس وقت کے مشہور ترین شعرا کے کلام کا معیار چیک کر لیں تو آپ کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں گے کہ اس عہد کے ادیب اور شعرا آنے والی نسل میں کونسا ادب منتقل کر رہے ہیں اور اگلے دس پندرہ سالوں میں حالات اور کتنے خوفناک ہوں گے۔

اب نسل نو کی نظر میں ادب کس چیز کی تربیت کا نام ہے ایسا لگ رہا ہے کہ ادب صرف لفظی تلذذ کا نام رہ گیا ہے۔ اس تکلیف دہ صورتحال میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ایک نباض اور حقیقی استاد کا کردار ادا کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ رومانوی شاعری ایسے بھی کی جا سکتی ہے۔ کس طرح اخلاق، ٹھہراؤ، تہذیب و تمدن اور اقدار کا پاس رکھا جاتا ہے۔ ماضی قریب میں احمد فراز اور فرحت عباس شاہ کی شاعری نمونے کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ایسی شاعری ذہنی تربیت اور آسودگی کا باعث بنتی ہے۔ اس حوالے سے کچھ اشعار دیکھیے:

ہمارا جسم بھی ہم سے رہائی چاہتا ہے
نمود خاک ہے لیکن خدائی چاہتا ہے

.....

یہ میرا دل تو مرے پاؤں پڑ گیا کل شام
یہ مجھ سے بڑھ کے ترے ہاں رسائی چاہتا ہے

.....

کہیں ریشم کہیں اطلس کہیں خوشبو رکھ دوں
یہ تمنا ہے تری یاد کو ہر سو رکھ دوں
یہ تبسم یہ تکلم یہ نفاست یہ ادا
جی میں آتا ہے ترا نام میں اردو رکھ دوں

اس کی آنکھیں بلا کی تاجر ہیں
جس کو چاہیں خرید لیتی ہیں
یہ جو تتلی ترے رخسار پہ آ بیٹھی ہے
پھول کے زعم میں تلوار پہ آ بیٹھی ہے

.....

تیرے ہاتھ کی چائے جاناں
ہائے ہائے ہائے جاناں
باد صبا کا اک اک جھونکا
تیری یاد دلائے جاناں
جیون میں کچھ رنگ نہ بھر لیں
کیا ہے تیری رائے جاناں

.....

ان اشعار میں احساس محبت، شعریت اور حسن طلب کا بہترین امتزاج موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ''مجال'' میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کا سیاسی و سماجی شعور پوری طرح بیدار اور متحرک ہے۔ یہ جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اپنی شاعری کی سچائی کی بدولت تاریخ بھی مرتب کر رہے ہیں کیونکہ شاعر اپنے وقت کا سب سے بڑا اور سچا مورخ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے اردگرد اور سماج میں جیسے کردار دیکھے جیسے سماجی رویے دیکھے ان کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر اپنا کتھارسس کر لیا۔ انھوں نے بڑی کامیاب کوشش کی ہے کہ ہلکے پھلکے انداز میں معاشرتی مسائل اور برائیوں کی نشاندہی کر دی جائے۔ انہوں نے بڑے لطیف پیرائے میں کچھ کرداروں کو طشت از بام بھی کیا ہے جنھوں نے معاشرے میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ میں بڑے وثوق اور دیانتداری سے کہتا ہوں کہ ایک انقلابی اور ترقی پسند شاعر کی روح ڈاکٹر اشفاق احمد ورک میں موجود ہے جس نے معاشرے میں ہونے والی ہر ناانصافی، جبر اور ظلم پر آواز اٹھائی ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھیے۔

رات رنگین ہوتی جاتی ہے
بات سنگین ہوتی جاتی ہے
آپ زردار بنتے جاتے ہیں
قوم مسکین ہوتی جاتی ہے
ہونٹ مسکان پر ہیں آمادہ
آنکھ غمگین ہوتی جاتی ہے

.....

شام کو مطلع صاف ہوا ہے
یہ کیسا انصاف ہوا ہے
اپنی قسطیں جاری اب تک
ان کا قرض معاف ہوا ہے
اس کی سمجھو پانچوں گھی میں
جو بھی نون سے قاف ہوا ہے

.....

بھوک سے لاچار ہے، افلاس سے مجبور ہے
کچھ نہ پوچھو یہ ہمارے شہر کا مزدور ہے

.....

کوئی نئی نہ تازی ہے
بندہ پھر بھی راضی ہے

مہنگائی کے بلوے ہیں
بچ جائے جو غازی ہے
موت کے منہ میں زندہ ہیں
اس کی کرم نوازی ہے

.....

''مجال'' میں ایک بڑی تعداد میں نظموں کی ہے جو انتہائی خوبصورت اور محبت سے لبریز ہیں۔ زیادہ تر مختصر نظمیں ہیں۔ انھوں نے بہت کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا ہے اور اس کام کو کوئی قادر الکلام شاعر ہی کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہم نے منیر نیازی اور فرحت عباس شاہ کی نظموں میں یہ بات دیکھ چکے ہیں۔ میرے نزدیک نظم کہنا غزل کہنے کی نسبت زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ نظم میں آپ کو زیادہ تخلیقی شعور، تخلیقی وفور اور رچاؤ درکار ہوتا ہے نظم میں خیال کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے اور پھر اس خیال کو مہارت سے مربوط کرنا پڑتا ہے جبکہ غزل میں قافیہ ردیف معاونت کرتے ہیں اور خیال کا خرچہ نسبتاً کم ہوتا ہے۔ نظمیں دیکھیے:

یادوں کی دہلیز ہے بیٹھا
دل کی تختی پوچ رہا ہوں
جانے میں کیا سوچ رہا ہوں

ایک اور نظم دیکھیے:

اپنے صحن میں کھلے پڑے ہیں
میٹھا ماضی
تیری یاد
گلاب کے پھول

ایک اور نظم جو مجھے سب سے زیادہ پسند آئی اس میں ان کا انداز دیکھیے:

آنکھ میں رت جگے مدینے کے
دل میں کربل بپا ہے یادوں کی
خواب بغداد ہو گئے میرے
نقش برباد ہو گئے میرے
میں بھی کونے سے ہو کے آیا ہوں
اپنا لاشہ اٹھا کے لایا ہوں

.....

یہ ہے ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کا وہ فکری جہان جس کو انھوں نے ہم سے شیئر کیا ہے جس میں کیا خوبصورتی ہے کیا شگفتگی ہے کیا شائستگی ہے کیا سلاست ہے کیا نفاست ہے کیا ٹھہراؤ ہے کیا رچاؤ ہے۔ ایک ایک مصرعہ اور ایک ایک شعر ان کے منفرد اسلوب اور ان کی فنی و فکری ریاضتوں اور بلندیوں کا آئینہ دار ہے۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ ان کی کتاب ''مجال'' وہ خوبصورت گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ کا پھول موجود ہے جن کی خوشبوئیں ہماری روح کو معطر اور ادبی ذوق کو جلا بخش رہی ہیں۔

آخر میں ان ایک شعر قند مکرر کے طور پر دیکھیے:

اس کی آنکھیں بلا کی تاجر ہیں
جس کو چاہیں خرید لیتی ہیں

☆☆☆☆☆

اسیر عابد بطور پنجابی مترجم ''دیوانِ غالب''

ثقافت کے بارے میں یہ بات مسلمہ ہے کہ یہ افراد کی معاشرت، جبلت اور طرزِ زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ فکر و خیال کی جلوہ آرائی سے تہذیب و تمدن کے ارتقا کے احساس و ادراک میں مدد ملتی ہے۔ ثقافتی اقدار کی بالیدگی جہاں قلبی وجدان، ذہنی سکون اور اطمینان کا وسیلہ ثابت ہوتی ہے وہاں اس کے اعجاز سے روحانی سوز و سرور کی لازوال دولت بھی میسر آتی ہے۔ تراجم کے ذریعے ثقافتی میراث کی منتقلی کا افادیت سے لبریز عمل سدا جاری رہتا ہے۔ زبان میں مضامین، موضوعات اور خیالات کی تونگری، تخلیقی فعالیت کی ہمہ گیری اور جذبہ شوق کی بے کرانی تراجم کی مرہونِ منت ہے۔ مترجم جب قلم تھام کر ترجمے پر مائل ہوتا ہے تو وہ ثقافتی اقدار کی ترسیل کے لیے اس بات کا التزام کرتا ہے کہ اس کے ترجمے پر قاری کو پختہ یقین ہو۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اگر کسی تخلیق یا ترجمے پر قاری کا اعتماد اور یقین متزلزل ہو جائے تو سارا عمل سرابوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور ساری محنت غارت چلی جاتی ہے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ایک زمین کے پودے کو دوسری اجنبی زمین میں لگانے کے مترادف ہے۔ کسی نقاد نے کہا ہے کہ کسی شعری تجربے کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا چائے کے باغات کو میدانی علاقے میں منتقل کرنے کے برابر ہے۔ ناسازگار جغرافیائی ماحول میں نباتات کے حسنِ نمو کو ''روحِ نمو'' کے فطری مزاج میں تبدیلی لائے بغیر برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ پنجابی تہذیب و ثقافت کے شیدائی اسیر عابد نے یہ ناممکن کام ممکن کر دکھایا۔ انھوں نے تراجم کو ثقافتی ارتقا کے لیے ناگزیر سمجھتے ہوئے دنیا کو غالب کی عظمتِ فکر سے روشناس کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے دیوانِ غالب کا جو منظوم پنجابی ترجمہ پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

پروفیسر اسیر عابد کا نام اردو اور پنجابی زبان و ادب کے منظوم ترجمے کی عظیم روایت کی حیثیت سے مسلم ہے۔ شعر و ادب ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ حمد و نعت سے لے کر سلام، منقبت و غزل تک اور شخصی مراثی سے احباب کے حضورِ خراجِ تحسین تک انھوں نے کئی صحرا عبور کیے لیکن ان کی اصل وجہ شہرت منظوم ترجمہ نگاری ہے۔ دیوانِ غالب، بالِ جبریل اور قصیدہ بُردہ شریف کا پنجابی میں منظوم ترجمہ، کلام بلھے شاہ کا اردو میں نثری

ثاقب تبسم ثاقب

ترجمہ اور ہیر وارث شاہ کا اردو میں منظوم ترجمہ، اُن کے ایسے کارنامے ہیں جو شاید رہتی دنیا تک اپنی مثال آپ رہیں گے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پروفیسر اسیر عابد، جن کا اصل نام غلام رسول تھا، کا تعلق ضلع گوجرانوالہ کی زرخیز ادبی سرزمین علی پور چٹھہ سے ہے۔ ان کے گاؤں کا نام سید نگر ہے۔ ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ دیوانِ غالب کا منظوم پنجابی ترجمہ ہے۔ اسے پہلی بار مجلسِ ترقی ادب لاہور نے مئی 1987 میں شائع کیا جو اب نایاب ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی سمیت بھارتی پنجاب کی یونیورسٹیوں میں بھی بے حد مقبول ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسیر عابد نے غالب کے اشعار کا ترجمہ کرنے کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے اصل شعر کے قریب رہ کے لفظوں کو پنجابی روپ دیا اور بحریں وہی رہنے دیں جو مرزا غالب نے استعمال کی ہیں۔ فن کے قدر دان اس خوبی کو بخوبی جانتے ہیں۔

کسی بھی تحریر یا بیان کا ابلاغ اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک اُسے اُسی زبان میں پیش نہ کیا جائے جو اُس کے قارئین یا سامعین کی مستعمل زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام طبع زاد تحریریں بالعموم اپنے اپنے ملک یا خطے کی مروج زبانوں میں ہی سامنے آئیں۔ لیکن ایک زبان کے علم و فن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا شعور بھی انسان کو عطا ہوا۔ عُرفِ عام میں اس شعور کو ترجمہ نگاری کا فن کہا جاتا ہے۔ ایک ترجمہ نگار کے لیے دونوں زبانوں کا ماہر ہونا ضروری ہے، بلکہ صرف ہر دو زبانوں پر عبور ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے، دونوں کے بولنے والوں کی تہذیبوں، ثقافتوں، محاورات اور ضرب الامثال تک سے اسے واقفیت ہو، کیونکہ جب تک وہ دونوں زبانوں کا مزاج آشنا نہیں ہوتا، اُس وقت تک وہ ترجمہ نگاری کے فرض سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ دنیا جہاں کے کلاسیکی ادب میں سے غزل کا ترجمہ مشکل کام سمجھا جاتا ہے اور اساتذہ غزل میں غالب کے کلام کا ترجمہ سب سے زیادہ مشکل اور بعضوں کے نزدیک ناموافق تصور کیا جاتا ہے کیونکہ غالب کے کلام کا فن اور غالب کا مزاج کسی سے لگا نہیں کھاتا۔ اس لیے کلام غالب کی ترجمہ نگاری سر اسر گھاٹے کا سودا ہے یہی وجہ ہے کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سمیت دیگر صاحبانِ علم بھی اس میں الجھ کے رہ گئے۔ لیکن پروفیسر اسیر عابد نے دیوانِ غالب کی ترجمہ نگاری کمال مہارت سے نبھائی ہے۔

غالب دنیا کے ان چند عظیم شعرا کی صف کے رکنِ اعظم ہیں کہ جن کے بغیر شعری ادب کی بلندیوں اور عظمتوں کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ غالب نہ صرف اردو شاعری کی معراج ہیں بلکہ وہ اردو زبان کی تہذیب کی اعلیٰ ترین صورت بھی ہیں۔ لہٰذا غالب سے آشنائی اردو زبان کی تہذیب کی اعلیٰ ترین صورت سے

آشنائی ہے۔ غالب صاحبِ ایجاد شاعر تھے اور فکر کی بلندیوں کے ساتھ ساتھ انھیں زبان کے فنی استعمال پر بھی خالقانہ قدرت حاصل تھی۔ یہ غالب کا ہی کمال ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو فارسی کے مقابلے پہ لا کھڑا کیا اور یہاں تک کہہ ڈالا کہ:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

....

(کیویں ریختہ ڈُنگھا فارسی توں جے کوئی پُچھے اسیر پنجابیاں نوں
اک وار سُنا کے کول اوہنوں غالب ہوراں دے بول سُنا کہ انج)

....

ایسے دعوے کے بعد غالب کی شاعری کو کسی بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل شاعری کے کمالات کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی امکانی وسعتوں اور عظمتوں سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔ پروفیسر اسیر عابد نے دیوانِ غالب کا منظوم پنجابی ترجمہ قریباً چودہ برس کی ایسی کامل ریاضت سے کیا کہ یہ ترجمہ بذاتِ خود ایک تخلیق کا روپ اختیار کر گیا ہے، اسی لیے تو احمد ندیم قاسمی اس کو ترجمے کا اعجاز قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں، ''اگر غالب زندہ ہوتا اور اُسے پنجابی کی شدید ہوتی تو ترجمہ سُن کر اسیر عابد کو سینے سے لگا لیتا۔'' احمد ندیم قاسمی نے جن اشعار کو مثال کے طور پر پیش کیا، وہ ملاحظہ کیجیے:

غالب کہتے ہیں:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

اب اسیر عابد کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

ساڈے ناتوں لگ لگا توڑیں نہ
کُجھ وی نئیں تے بھلیا اِٹ کھڑکا سہی
اسی کدی وی اکّوں ہر نہ چکاں گے
بے پرواہیاں تیرا لکھ وسیبا سہی

....

غالب کی ایک معروف غزل کے چند اشعار اور ان کا ترجمہ دیکھیے، اک لذت بامعنی محسوس ہوگی۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اب اسیر عابد کے تخلیقی ترجمے کی گرفت ملاحظہ ہو:

پکی گل اے، مرنا اک دن متھیا اے
نیندر کاہنوں راتیں جھلی آوندی نئیں
اگے دل دے حالوں ہاسڑ آوندی سی
ہون کسے وی گلوں بھیڑی آوندی نئیں

اور یہ شعر---

منیا! متھے ٹکیاں اجر ودھیرے نیں
ایسے پاسے طبع کھچی آوندی نئیں

....

ان اشعار میں اِٹ کھڑکا، جھلی، بھیڑی اور کھتی ایسے الفاظ سے غالب کے اشعار کا مفہوم انتہائی گہرائیوں تک واضح ہو جاتا ہے بلکہ اسیر عابد کے ان اضافوں نے غالب کے اشعار کی تفہیم میں بھی اضافے کیے ہیں۔ میں تو یہ بھی مانتا ہوں کہ غالب کے سہلِ ممتنع کو اسیر عابد نے اپنی بے پناہ مہارت سے ایسا بانکپن بخشا ہے کہ اس کی رعنائیوں اور شوخیوں پہ دل ہارنے کی کیفیت باندھ دی ہے۔ مثلاً اس شعر کا تذکرہ نہ کرنا تو زیادتی ہوگی۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اسیر عابد نے داخلیت کی اس فضا کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ دل بے اختیار اش اش کر اٹھتا ہے:

کنڈ ھے ول آساں دی بیڑی آوندی نہیں
اصلوں کوئی شکل وی نظری آوندی نہیں

....

پروفیسر اسیر عابد نے غالب کے رنگ کو اس طرح رنگ دیا ہے کہ اس کہکشاں کے سبھی تارے اپنی چمک دمک کے حوالے سے اپنی پائندگی کے ارفع مقام تک پہنچے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے غالب فہمی کو ایسے انداز میں اجاگر کیا ہے کہ غالب کی اردو شاعری، پنجابی کا چولا پہن کر سرزمینِ پنجاب کی چیز لگنے لگی ہے۔ غالب کی شاعری کا سارا رکھ رکھاؤ اور وقار ملحوظ رکھا۔ ترجمے کے دوران اگر اسیر عابد نے کہیں اجتہاد سے کام بھی لیا تو رنگِ غالب کی شدت کم نہیں ہوئی بلکہ لو دیتی ہوئی اور بھی سنہری ہو گئی۔ احمد ندیم قاسمی کا ایک دیکھیے، جس سے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ رہے گی کہ اسیر عابد نے دیوانِ غالب کو کیسا برتا ہے۔ فرماتے ہیں:

”اسیر عابد نے کسی ایک مقام پر بھی غالب کے ساتھ زیادتی کا ارتکاب نہیں کیا اور دیوانِ غالب کا ایک ایسا منظوم پنجابی ترجمہ وجود میں آیا جو آئندہ صدیوں تک ترجمے کا معیار قرار دیا جاتا رہے گا۔“

مرزا غالب کو عام طور پر مشکل شاعر کہا جاتا ہے۔ دراصل وہ مرزا کی جدت طرازی ہے جس کے شوق نے انھیں معمولی باتوں کی نئی نئی تشبیہات، استعارات اور کنایات وضع کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے جس باریک بینی اور تجزیاتی ادراک سے شعر کہے اس کے باعث وہ زیادہ مشکل پسند اور مشکل گو شاعر نظر آتے ہیں۔ اس مشکل گوئی کے باعث غالب کے مترجمین کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اسیر عابد نے کلامِ غالب کی روح میں اُتر کر اُس کے حقیقی معانی کو تلاش کیا اور اس کے بالمقابل پنجابی زبان کے الفاظ کو اس ہنرمندی سے برتا کہ غالب کی نکتہ آفرینیوں سے لے کر تراکیب بندیوں تک ہر شعر تخلیقی کٹھالی سے گزر کر کندن بن کر یوں سامنے آتا ہے کہ مفہوم غالب سے لے کر ابلاغ غالب تک کے مراحل بتدریج طے ہونے لگتے ہیں۔ غالب کی تراکیب کو سمجھنا اور ان کے بالمقابل پنجابی تراکیب کا ٹونا برتنا ایک ایسے مشاق اور ہنرمند شاعر کی طلب کرتا ہے جو ان تراکیب کو پنجابی کا حقیقی روپ بخش سکے۔

اسیر عابد کے ترجمے کے بعد تراکیب کا یہ مسئلہ بخوبی حل ہو جاتا ہے۔ غالب جس طرح اردو ئے معلی میں تراکیب سازی کا نیا جہان آباد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی طرح اسیر عابد بھی پنجابی زبان میں نئی تراکیب اُساری کی مضبوط روایت کا سنگِ میل بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ انھوں نے دیوان غالب کے ترجمے میں اپنی اس ہنرمندی کے بے شمار نئے جہان تخلیق کیے۔ ذرا غور فرمایئے کہ ''آتشِ زیرپا'' کو ''پیراں یٹھ چواتیاں'' کہا گیا، ''جذبہ بے اختیار'' کو ''اتھری سدھر'' سے سنوارا گیا، ''فتنہ خُو'' سے ''آخر جوگا'' کو ملایا گیا اور ''نالہ دل'' کو ''ہُوک دِلے دی'' اور ''آتشِ پنہاں'' کو ''لُکھیاں اگاں'' سے جوڑا گیا۔ ایسی شاندار ترکیب سازی کے ساتھ ساتھ انھوں نے شعر کا جمالیاتی حسن، بانکپن اور نزاکتِ طبعی کا بھی پورا خیال رکھا۔ انھوں نے معنی کے ابلاغ کے لیے شعر کے حسن کو مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ اس کے لیے انھوں نے عروضی بحروں اور لسانی حوالوں سے نئے تجربے کر کے پنجابی زبان کی بے مثال وسعت کے نئے امکانات کی بھی خبر دی۔ اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذت درد
کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

ترجمہ دیکھیے:

سدھراں بھنڈیا دل وی اپنا ڈسی درد سواداں لنگر
جنھے جنا چکھیا اونا اونا رجیا ڈھڈھا

اسی طرح یہ شعر اور اس کا ترجمہ بھی اعلیٰ ہے:

جلوہ گُل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو
یاں رواں مژگاں چشم تر سے خون ناب تھا

ترجمہ:

اودھر پُھلاں دی چھاں پاروں دیوے ندیاں وچ تردے سن
ایدھر پلکاں دے چشمے توں رت خالص جگروں جاری سی

اسیر عابد نے مرزا غالب کی مشکل پسندی اور تغزل کو ایک دلربائی سے اپنایا۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر خالد احمد کا ایک پنجابی جملہ آپ کی سماعتوں کی نذر کروں۔ جملہ سُنیئے: ''جے غالب وی پنجابی لکھدا تے انجے ای لکھدا۔'' میں سمجھتا ہوں کہ خالد احمد کا یہ جملہ نہ صرف اسیر عابد کو شاندار خراجِ تحسین ہے بلکہ ان کے کام کا اعتراف بھی ہے۔

غالب کے شعری جہان میں ان کی گرمیِ محفل کی لذت بھی پورے اہتمام کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اسیر عابد نے ان لمحوں کے مناظر کو یوں سمیٹا ہے کہ روحِ غالب ان کے ترجموں میں بھی رواں دکھائی دیتی ہے اور لذت گفتارِ غالب، اس کا تو نشہ ہمیں اسیر عابد کے ترجمے میں پورے جوبن پر یوں دکھائی دیتا ہے کہ حسنِ ترنمِ غالب سے ہماری سماعتیں مشک بار ہونے لگتی ہیں۔ غالب کی سُنیے:

رات کے وقت مئے پیئے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یُوں
مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح؟
دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یُوں

اب دیکھیے کہ اسیر عابد کا ترجمہ کیا کہتا ہے:

دیدارات راہ دے تے پئی ہوئے سنگت نال رقیب دے کتی ہوئے
ربا آون دی ایدھر نتی ہوئے، ربا جیہا نہ چن چڑھا کہ انج
میں نچّیا یار نے در تے کی کیوں ہوش اُڈاریاں مار جاندے
ترس کھا کے میری مدہوشیاں تے، کوئی اُڈ کے لنگھی ہوا کہ انج

مرزا غالب نے تلمیحات کے استعمال سے جا بجا اپنے دیوان کو مرصع کیا ہے۔ انھوں نے جہاں بھی کسی تلمیح کو برتا ہے، وہ پورا واقعہ اپنے مکمل تاریخی پس منظر کے ساتھ ہمارے آئینہ خانہ تصور میں یوں آ بستا ہے کہ ہم خود اس واقعے کو اپنی چشمِ تصور سے اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ گویا ہم بھی شریکِ محفل ہیں اور یہ واقعہ پورے محاکات کے ساتھ ہماری نگہ و گوش سے دید بازی اور سمع خراشی کرتے ہوئے دھیرے دھیرے گزر رہا ہے۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش مگر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

امیر عابد نے اس خوب صورت اور نادر واقعے کو اس طرح سے موزونیتِ طبعِ غالب سے پنجابی میں ترجمہ کیا ہے کہ ہم بندی خانے، آنکھوں اور انتظار سے بھی گزرتے ہیں اور حضرت یوسفؑ کی زیارت کے لیے مصر کی حسین عورتوں کو اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹتے، ان سے لہو کو ٹپکتے اور پھر زلیخا کو اس لمحے کی شادمانی اور مسرت کی حقیقی لذت لیتے بھی دیکھتے ہیں۔ ترجمے کا یہ حسن ایک طرف غالب کے شعری عظمت کا اقرار ہے تو دوسری طرف امیر عابد کے فنِ ترجمہ کاری کا ایسا اظہار ہے جو فقط انھی کے قلم کو زیبا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ بھی اس لذت میں میرے ساتھ شامل ہو جائیں:

بھانویں بندی خانے سار لئی یعقوبؑ نہ یوسفؑ دی
پر کالی کوٹھی دی کندھے جھرنے اکھیاں ہو گئیاں
سارے مڑن رقیباں توں پر سینے ٹھنڈ زلیخا دے
مصری ناراں تک یوسفؑ توں ہکیاں بکیاں ہو گئیاں

اس ''ہکیاں بکیاں'' کی داد تو امیر عابد زنانِ مصر سے بھی لے سکتے ہیں۔

کلامِ غالب میں ہمیں جا بجا محاورات اور ضرب الامثال کا ایک پُر شور دریا لہریں لیتا دکھائی دیتا ہے جس کی بنا پر بلا شک و شبہ غالب اپنے معاصرین میں سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی بنا پر غالب ایک مخصوص تہذیب کے داعی اور دلدادہ بھی نظر آتے ہیں۔ امیر عابد نے ان محاورات اور ضرب الامثال کو کچھ اس طرح سے پنجابی میں ترجمہ کیا ہے کہ ہم پنجابی رنگ و آہنگ کا واضح فرق بھی دیکھ سکتے ہیں اور امیر عابد کی ہنرمندی کا شوخ رنگ بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ یہ رنگ غالب کے رنگ سے اتنا کھلا ہوا ہے کہ ہم کوئی خطِ امتیاز تو نہیں کھینچ پاتے البتہ امیر عابد کے فن کی جادوگری میں کھو جاتے ہیں اور غالب کی تہذیب ہمیں پنجابی میں انتہائی

مانوس لگتی ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر تیرا وقتِ سفر یاد آیا!

ترجمہ:

آخر پیڑاں حالی ڈھونگ نہ کڈھی سی
فیر تیرے ٹُر چلن دا ویلا یاد پیا

....

ہوا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

ترجمہ:

شاہ دی بنی بیٹھدا اے، تاں ای اوڈی نہیں سو لگدی
نہیں تے دسو شہر اندر غالب دی واہ واہ کیہ اے؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

ترجمہ:

جدوں تیرے بناں رہا! ڈھول نہیں وجدا
فیر طوطیاں نقاریاں دا رولا کیہ اے؟

....

غالب کی شاعری میں ان کا تصورِ حسن و عشق بڑی خوب صورتی کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔ ان کے احساسات اور جذبات کی آئینہ داری عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک رسائی حاصل کر کے ایک فلسفیانہ اندازِ فکر میں ڈھل جاتی ہے۔ اسیر عابد غالب کے عشقیہ اشعار کو جب پنجابی کا لباس پہناتے ہیں تو ان کی حسن بیانی سے انحراف دکھائی نہیں دیتا بلکہ ان کے اشعار کی خماری اور لذت بھی دو آتشہ ہو کر ہمارے احساسات پر وارد ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ترجمہ:

جگ تے کجھ وی نہیں معشوق دیاں نیں لشکاں
اپنا آپ جے حسن نہ ویہندا اسیں وی کتھے ہیساں

....

اسیر عابد نے غالب کی شوخی اور بے ساختگی کو اس فنکاری سے سنبھالا ہے کہ اردو معلی سے اردو محلّہ کے پنجابی ڈھنگ تک ہمیں ایک ہی لے دکھائی دیتی ہے۔ شعر کے تیور اور رنگ ڈھنگ میں غالب کا مخصوص اسلوب اپنے پورے جوبن کے ساتھ یوں رقصاں ہے کہ اسیر عابد، غالب میں کہیں گم ہو جاتے ہیں اور پھر دکھائی نہیں دیتے۔ ترجمے کا یہ اعجاز اسیر عابد کے ترجمے میں ہی موجود ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کو پاؤں

ترجمہ:

رات کے دے سُفنے اندر ٹُر کے آیا لگدا اے
اج اینویں نہیں مٹھیاں بھردا چند ملوکے پیراں نوں

....

ان اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسیر عابد نے پنجاب کے مخصوص روایتی طرزِ زندگی اور بولی ٹھولی کو اس طرح سے دیوانِ غالب کے ترجمے میں سمویا ہے کہ پنجابی کلاسیکی روایت اور دہلی کی ٹکسالی زبان، محاورہ بندی اور طرزِ زندگی رل مل گئی ہے۔ اسیر عابد کا یہ ترجمہ پنجابی زبان و ادب کے ماتھے کا جھومر بن کر دیوانِ غالب کی

دمک اور بھی آبدار بنا رہا ہے۔ اسیر عابد کے فن کی حقیقی قدر شناسی بشیر منذر کے اس خراجِ تحسین سے واضح ہو جاتی ہے، وہ کہتے ہیں:

''اسیر عابد نے غالب جیہے شاعرنوں ہتھ پا کے اگلیاں پچھلیاں کسراں کڈھ دتیاں نیں تے سارے دھونے دھو دتے نیں۔ اوہنے گنج وچ کے غالب نوں دس دتا اے کہ جناب، ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں، جیہڑے پنجابی وچ تہاڈے ورگے شعر لکھ سکدے نیں۔ میرا خیال اے کہ واقعی جے غالب دے کنیں ایہ شعر پے جان تے اوہنوں ضرور شک ہو جائے کہ شاید ایہ میں ای لکھے نیں۔ مینوں اِنج لگدا اے غالب نال بہت وڈھا دھرو ہویا اے۔ ایہ ترجمہ کر کے اسیر عابد نے غالب دے پورے دیوان تے مَل مار لئی اے۔ ہُن لوکی آکھیا کرن گے اسیر عابد دا دیوانِ غالب پڑھیا اے، لکھیا سُوتے سوہنا لکھیا سُو۔''

بشیر منذر کے اس خراجِ تحسین کی گواہی تو یہ شعر بھی دیتا ہے، ملاحظہ کیجیے کہ اس شعر میں اسیر عابد، غالب کو پنجابی ادراک اور شعور کی سطح کے کتنا قریب لے آئے ہیں:

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبُو کیا ہے؟

ترجمہ:

پنج ست مٹ شراب جے دِسے، پیندا چنگا لگناں
جھجر، واہڑی، گاگر، چھنا، گھڑا، پیالہ کیہ اے؟

پروفیسر اسیر عابد نے دیوانِ غالب کا ترجمہ اتنی علمی شان و شوکت کے ساتھ کیا ہے کہ یہ پنجابی زبان پر ان کی بے پناہ دسترس کی ایک عظیم یادگار کی حیثیت سے انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ بطور مجموعی یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ اسیر عابد دیوانِ غالب کے ترجمے میں اپنی اُن تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں جو ایک اچھے ترجمے کے لیے لازمی و ابدی ہیں اور جن کے بغیر ترجمے کا اعجاز وجود میں نہیں آتا۔ غالب ایسی شخصیت کی شاعری کے اسرار و رموز کو پہلے خود سمجھنا، پھر خود کو اُن کے زمانے اور ماحول تک لے جا کر اُن کے فکری محاسن اور فنی پیمانوں کو جانچنا، پھر لفظی ترجمے سے خود کو بچانا، معنوی اعتبار سے ترجمانی کی سعی کرنا اور پھر لفظوں کو موسیقیت کی میزان میں تولنا فن کی معراج ہے جو اسیر عابد کے حصے میں آئی ہے۔ اس ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسیر عابد نے ترجمے کو محض لفظوں کی تبدیلی نہیں سمجھا بلکہ ایک تہذیب سے جنم لینے والے تخلیقی عمل کو ایک دوسری تہذیب کے اندر بدل دیا ہے اسی لیے یہ ترجمہ تہذیبوں کے مابین مکالمے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہ ترجمہ دیوانِ غالب کے شانہ بشانہ پورے وقار کے ساتھ کھڑا پنجابی زبان و ادب کا مان بڑھاتا رہے گا اور مستقبل میں کلامِ غالب کے پنجابی ترجمے کے لیے اعلیٰ معیار بن کر قائم رہے گا۔

☆☆☆☆☆

تاثرات کے آئینے میں ..... [کومل شہزادی]

کومل شہزادی اُردو کی دنیا میں ایک ابھرتی ہوئی نقاد اور ادیبہ ہیں۔ جو باقاعدہ طور پر درس وتدریس سے منسلک ہیں اور پی ایچ۔ ڈی کر رہی ہیں۔ ان کی ادارت میں تسلسل سے ادبی جریدہ ''نقش فریادی'' بھی شائع ہوتا ہے۔ حال ہی میں ان کی چوبیس مختلف کتب (راقم کی کتاب پر لکھا ہوا تبصرہ بھی شامل ہے) کے تبصروں پر مبنی کتاب ''تاثرات کے آئینے میں''، ادب، سماج، انسانیت پبلی کیشنز سے شائع ہوئی ہے۔

مشمولہ تبصروں میں مختلف اصناف و انواع کی کتب شامل ہیں۔ مبصر نے تحقیقی کتب میں سفر نامہ، نظم، غزل وغیرہ اور ناول، افسانہ، شاعری پر کی گئی تحقیقی وتنقیدی کتب پر تبصرہ کیا ہے۔۔

کسی بھی کتاب پر تبصرہ لکھنا دراصل اس کتاب میں موجود مواد کی توضیح وتصریح ہی ہوتی ہے۔ جس کو کومل شہزادی نے احسن طریقے سے سرانجام دیا ہے۔ کتاب کے متن کے حوالے سے اختصار کے ساتھ تعارفی گفتگو کی ہے۔ مصنف کی فکر ونظر، تلاش وجستجو، اُسلوب بیان اور ندرت اظہار کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔۔

تبصرہ کسی کتاب کا وہ تعارفی خاکہ ہوتا ہے جس سے قاری کو کتاب کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور کتاب کی افادیت سے بھی وہ باخبر ہو جاتا ہے اور تحریری صورت میں دوسرے قارئین کو مطلع کرتا ہے۔۔ اسی اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے کومل شہزادی نے مختلف کتب پر اپنی ناقدانہ رائے دی ہے۔

عاصم بٹ کی ترجمہ شدہ کتاب ''انسان اپنے روبرو'' کے بارے میں کومل شہزادی لکھتی ہیں:

''انسان کی اخلاقیات اور نفسیات کا بہت گہرائی سے مطالعہ اس کتاب میں موجود ہے مترجم نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے انتہائی محنت اور لگن سے اس کو تکمیل تک پہنچایا ہے۔ بہت پیچیدہ کتاب کا ترجمہ مطالعہ کے دوران ایسا کوئی شائبہ نہیں ہوتا کہ اس ترجمہ شدہ کتاب میں کوئی خامی موجود ہے۔ انسان کی نفسیات پر لکھنا بلاشبہ مشکل کام ہے۔ انسان کی اخلاقی نفسیات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے اور ترجمے کا اس سے بھی عمدہ انداز ہے۔ انسان کی اخلاقی نفسیات سے شعور وآگاہی کے لیے یہ کتاب بہت مددگار ثابت ہوگی۔''

خالد فیاض کی کتاب ''متن، قرات اور نتائج'' پر کومل شہزادی رائے کچھ یوں پیش کرتی ہے:

''کتاب کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ

منیر عباس سپرا

فکشن شاعری اور عالمی ادب جس پر مصنف کو عبور حاصل ہے۔ ساری کتاب ہی منفرد ہے لیکن بنا کسی تعصبانہ رائے کے پہلا حصہ اور مصنف کا انتخاب اور اسی سلسلے کے تمام مضامین کو عمدہ انداز میں لکھنا قابل داد ہے۔ کتاب میں پہلے حصے اور آخری دو حصوں کے مضامین جو ہمیں کہیں بھی چیدہ چیدہ پہلو ہی پڑھنے کو ملیں گے لیکن اس کتاب میں بہت سے نئے موضوعات پڑھنے کو ملیں گے جو مصنف نے قاری کے لیے تنقید کے ساتھ معلوماتی مضامین بھی بنا دیا ہے۔''

کومل شہزادی نے راقم کی کتاب ''اُردو فکشن کا نیا تخلیقی منظر نامہ'' پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اردو فکشن میں جدید اصناف پر نیا شاہکار اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ آئندہ اس صنف میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ کتاب کی طوالت قاری کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے، اگرچہ وہ کتابیں محققین کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں، علاوہ ازیں جن کتابوں میں اختصار کا پہلو اختیار کیا گیا ہے --- اردو فکشن کا نیا تخلیقی منظر نامہ میں اختصار، جامعیت اور شاندار شاہکار ہے۔''

فرخ سہیل گوئندی کا سفر نامہ ''میں ہوں جہاں گرد'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کومل شہزادی رقم طراز ہیں:

اس سفر نامے کی خوبی یہ ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے آپ خود کو اس سفر کا حصہ سمجھتے ہیں۔ مصنف کے سفر نامے میں دکھائے مختلف مقامات ان کو دل ربا منظروں کے کیف کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں کا اسلوب نہ ہی سادہ کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی پیچیدہ کیونکہ کچھ سفر ناموں میں پیچیدہ الفاظ بھی موجود ہیں۔ اس کے باوجود ان کے الفاظ کا انتخاب ہر سفر نامہ کے حوالے سے عمدہ رہا جس انداز میں ان کو بیرتا گیا ہے۔ مکالماتی انداز میں سفر کی روداد کو خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے۔''

کومل شہزادی نے اپنے تبصروں میں اگر کسی کتاب میں کسی موضوع پر نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے تو اس زاویہ نگاہ کی جانب سے قارئین کی خاص طور پر توجہ مبذول کروائی ہے۔ ان درج بالا اقتباسات سے بھی یہ بات واضح ہو رہی ہے۔

تبصرہ میں مبصر کتاب کے مطالعہ کے بعد اختصار کے ساتھ اپنی ناقدانہ رائے دیتا جس میں اس کتاب کے محاسن و معائب بیان کرتا ہے جس سے قاری کو کتاب کی اہمیت کا انداز ہوتا ہے اور اہم معلومات حاصل ہوتی ہے۔ جس سے قاری کو کسی کتاب سے متعلق رائے قائم کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ انہی اصولوں کی بنیاد پر کومل شہزادی نے تمام کتب پر تبصرہ کیا ہے اور ہر تبصرے کا الگ سے عنوان بھی باندھا ہے۔

مصنفہ نے کتب کے مندرجات اور اسلوب بیان کو کلیدی حیثیت دی ہے اور مواد کے مثبت و منفی پہلوؤں کو اپنے تفکرات و نظریات اور تنقیدی شعور کی بنیاد پر مختصر انداز میں واضح کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

اردو کا ادراکی تنقیدی دبستان ۔۔۔۔۔

محترم فرحت عباس شاہ کا وقیع مجموعہ نقد و نظر ۔۔۔۔ ایک جائزہ ۔۔۔۔

فرحت عباس شاہ کی شخصی و تخلیقی زندگی کا کوئی گوشہ صاحبان بصیرت سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ان کی اچھوتی شاعری نے دنیائے شعروادب کو مستنیر کیا اور ہنوز یہ سفر پورے تخلیقی رچاؤ اور جمالیاتی سجاؤ سے جاری ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری موضوعات کے چناؤ اسالیب کی جدت اور جذبہ وخیال کی ترسیل میں فصاحتی و بلاغتی حسن کے ساتھ آفاقیت کو سمیٹے ہوئی ہے۔

ان کی طویل نظمیں ان کے شاعرانہ اجتہاد کی آئینہ دار ہیں۔

انہوں نے کائناتی المیے بانجھ رتوں کے نوحے داخلی شکستگی محبتوں کے عمیق تجربات فردی اکلاپے اور اجتماعی دکھوں کو شاعرانہ نروان سے تجسیم کر دکھلایا۔ فرحت عباس شاہ اس عہد منافقت میں شعری دیانت اور ادبی صداقت کا استعارہ ہیں۔

وہ شاعری کے سماجی نصب العین کے قائل اپنی تہذیب، تاریخ اور اقدار و پندار سے جڑے شاعر ہیں جو کسی ٹیمن کے سپہ سالار یا ادبی مجاوروں سے مرعوب ہونا کفر گردانتے ہیں۔ اسی باطنی شکتی نے انہیں مفادات اور کھوکھلی رسمیات میں لپٹے ادبی بونوں کے خلاف شمشیر بے نیام کیا ہوا ہے۔۔ شاہ صاحب استحصالی گماشتوں اور سرمایہ داروں کے تلوے چاٹتے بے ضمیروں کو شعری و ادبی عدالت میں لا کھڑا کرتے ہیں اور ان کے ایسے لتے لیتے ہیں کہ وہ روسیاہ اپنے دغش چہروں کو چھپاتے پھرتے ہیں۔

فرحت عباس شاہ کی ہمہ جہتی نقش عالم پہ ثبت ہے اب ان کی بطور ادراکی نقاد کے ایک اور جہت آشکار ہوئی جو ادبی دیانت اور شعری صداقت کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ اردو تنقید۔۔ بھی عجب بھیدوں بھری بھول بھلیاں ہے۔ اس کا

عمران میر

آغاز ہی مغربی نقالی و جگالی سے ہوا،اور یار لوگوں نے کھینچ کھانچ کر تنقید کے نام پر وہ یاوہ گوئی اور وہ دفتر رقم کیے کہ الاامان - - - الاامان--- کچھ تو تنقید میں قصائد رقم کرتے رہے اور بعضوں نے تنقیص و تعصب کی وہ قے کی--- کہ قاری کو اس خرابے سے دور ہونا پڑا --- تنقیدی منصب بار بار بگڑا اور ایسا بگاڑا گیا کہ ذہنوں کا تعصب جانبداریت اور سطحیت نے بجائے تفہیم و تفسیر کرنے کے تخلیق کاروں کی تحقیر و تحقیر کی --- کچھ ناقدین نے کمزور اور رسمی سے شاعروں کو یوں ہانس پہ چڑھایا کہ وہ خبط عظمت کے ہیضے میں مبتلا ہو گئے--- مغرب سے مرعوب ذہنی غلاموں نے جدیدیت مابعد جدیدیت تشکیل اور رد تشکیل آبادیات و نو آبادیات کی وہ گردانیں الاپیں اور فیشن ایبل اصطلاحات کا ورد یوں کیا کہ مشرقیت برصغیری تل وطنیت اور اپنی مٹی و رہتل کی بو باس ہی گم ہو کر رہ گئی--- ہمارے شعر و ادب کے پیمانے ہمارے اپنے ہونے چاہئیں تھے ہم اپنی نظم کو یا غزل و ناول کو جب مغربی تھیوریوں سے پرکھیں گے نتیجہ کیا نکلے گا ---- ہر زبان کا اپنا تاریخی و تہذیبی کلچر ہوتا ہے جو دوسری زبان سے مختلف ہوا کرتا ہے ہر کلچر کی اپنی اقدار ہیں --- خیر---- اس کٹھور رت میں جگالی و نقالی کی وبا میں، اگر کوئی ذاتی خدوخال سمیت اور ذاتی مزاج و اپروچ سمیت دکھائی دے ذہنی غلامی کے اسیر اسے مصلوب کرنے لگتے ہیں ---- فرحت عباس شاہ نے ادرا کی تنقیدی دبستان کو متعارف کروا کر ادیب اور غیر ادیب شاعر اور غیر شاعر حقیقی ادب اور مصنوعی ادب کے مابین حد فاصل اس تنقیدی لیاقت سے قائم کی ہے کہ ان کی عقلی صداقت اسے ایک بڑا ناقد منواتی ہے۔ شمع محفل کی آتش افروزیاں جب سرد پڑ جائیں تو احساس کے بھانبھڑ مچاتے گیانی کا ظہور کسی نعمت سے کم نہیں---

اردو کا ادرا کی دبستان چار حصوں پہ محیط ہے

مباحث---

ادرا کی نقد و نظر حصہ ناول

ادرا کی نقد و نظر حصہ افسانہ

ادرا کی نقد و نظر حصہ شاعری

فرحت عباس شاہ بطور ادرا کی نقاد کے یوں بھی لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے رائج مغالطوں کو اور سماجی ٹیبوز کو چیلنج کیا ہے--- مصنوعی و کھوکھلی لکھتوں کو بہانگ دہل سطحی کہا ہے اور اچھی لکھتوں کی قدر افزائی کی ہے۔ انہوں نے مجید امجد میراجی اور جون ایلیا پہ نیا لکھا ہے اور نیا کہا ہے--- اور منطقی استدلال ایسا کہ قاری ان کے تنقیدی وجدان کا اسیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر نقاد تفہیم و تفسیر کسی دباؤ میں کرے یا تعصب کی عینک ڈالے رکھے یا کمزور مطالعہ کا حامل ہو تو فکری مغالطوں کا چلن عام ہوتا ہے۔ گھگھیاتے ممیاتے اور جاہ طلب نقادوں کی کثرت اور نصابی مدرسین کے جھرمٹ میں فرحت عباس شاہ کا دبنگ تنقیدی اسلوب اور دھرتی کے حقیقی شعری و ادبی ہیروز کی بازیافت ادرا کی تنقید کا منہج ہے--- شاہ جی کے لیے شبھ کامنائیں---

☆☆☆☆☆

رومانیت اور احساس ہجر و وصال کا شاعر...... غلام حسین ساجد

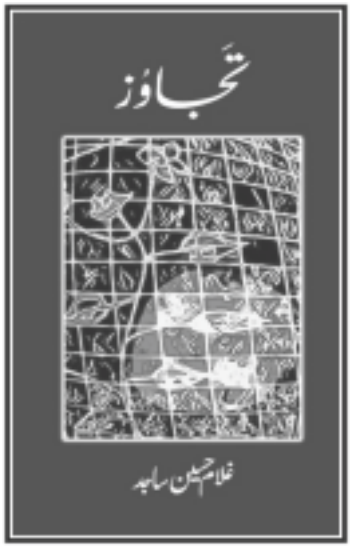

جذبات واحساسات اور تخیلات کا اعلیٰ ترین ذریعہ شاعری ہے۔

شاعری بنیادی طور پر وہ احساس ہے جس میں ترنمی اصول نمایاں ہوتے ہیں۔ دھڑکنوں کی آہٹیں جو سینے میں چھپی ہوتی ہیں وہ شاعرانہ مزاج میں اس طرح ابھر کر سامنے آتی ہیں کہ شعور ان تخیلاتی موجوں کے ساتھ بہہ جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے شاعری کا تعلق شعور سے ہے اس لیے کہ شعور ان کو مشاہدات پہ اُکساتا ہے وہ ہر شے کو مشاہداتی انداز میں پرکھنے کی کوشش میں ایک مزدور کی طرح جُت جاتا ہے اس میں کمال یہ ہے کہ یہ مزدور شعور کی بلند سطح کو چھو کر تخلیق کے اس مقام پر دستک دیتا ہے جہاں اسے اجرت کی طمع یا مفاد کا لالچ نہیں رہتا۔ اس لیے کہ اسے علم ہے کہ وہ جس زاویہ سے

زمانے کا مشاہدہ کر رہا ہے اس طرح مشاہدہ کرنے کی یہ اہلیت رب کائنات ہر کسی کو عطا نہیں کرتا۔ اس کائنات کی تخلیق میں شاعرانہ ذوق واضح ہے۔ کہیں بلند و بالا پہاڑوں کے دامن سے بہتے چشمے، بل کھاتی ندیاں، لہروں کو محبت سے اچھالتے سمندر، تسلسل اور روانی کا مظہر دریا، زمین کے سینے پہ لہلہاتے کھیت، سرگوشیاں کرتی فضائیں، گنگناتی ہوائیں، اپنے دامن سے خوشبو بکھیرتے پھول، اور ان خوشبوؤں کو اپنے دوش پہ سوار کر کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک احساس تفاخر سے لے کر چلتی ہوائیں، سورج کی کرنوں کا رات کے اندھیرے سے بغاوت کر کے فتح کا علم لہرانا، شام ڈھلتے ہی مہتاب کا اپنے دامن میں ٹھنڈک

انصر منیر

بھر کر لانا، ستاروں کے جھرمٹ کا کہکشاؤں کی صورت میں ابھرنا، ان سب قدرتی حقائق کو ایک جگہ سمو کر بالترتیب انداز میں سوچ کی بھٹی میں پکا کر، فکر کی پختہ عمارت تعمیر کر کے اسے الفاظ سے مزین کرنا شاعری ہے۔

انسانی سوچ نے جس قدر ترقی کی ہے اس قدر اس میں ڈر اور خوف بھی بیٹھ گیا ہے اس لیے آج سہمے سہمے کے اس دور میں جب مادیت نے انسان کو زیر کر لیا ہے۔ اور ضرورتوں نے انسان کو معاشی حاجات میں الجھا کر احساس و محبت کو مفید کر کے انسان کی سوچ سے احساس و محبت کے نقوش کو مٹانے کی سعی کی ہے۔ ہوائیں آندھیوں کی صورت اختیار کر گئیں ہیں۔ اگر ایسے خوفزدہ، افسردہ اور نفرت زدہ ماحول میں کوئی احساس و محبت کو افلاس و احتیاج کی قید سے رہائی دلانے کی کوشش کرے یا وہ آندھیوں کے مقابل دیے جلائے تو وہ قابلِ تحسین ہے۔ یہی کمال غلام حسین ساجد نے اپنی غزلوں میں دکھایا ہے۔

غلام حسین ساجد صاحب کا ادبی قد اتنا بلند ہے کہ مجھ جیسے طفلِ ادب کے لیے لب کشائی کرنا ادبی جسارت متصور ہوگی۔ نوید صادق صاحب جو کہ ایک عمدہ اور شفیق انسان ہیں کہ ذریعے معلوم ہوا کہ غلام حسین ساجد صاحب کی کتاب کی تقریب پزیرائی منعقد ہو رہی ہے تو یہ خیال کروٹیں بدلنے لگا کہ اگر غلام حسین ساجد صاحب جیسی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں گفتگو کرنے کا موقع میسر آجائے تو میں بھی یہ شیخی بگھار سکوں گا کہ ایک عظیم شخصیت کی تحسین میں میرا بھی رائی برابر حصّہ ہے۔ جس کے لیے میں نوید صادق صاحب کا ممنونِ احسان ہوں

متنوع مضوعات پر مشتمل کتاب تجاوز کو رنگِ ادب پبلی کیشنز نے زیورِ طبع سے آراستہ کر کے ادبی ذوق رکھنے والوں پر احسان کیا ہے۔ غلام حسین ساجد ایک وسیع المطالعہ اور سنجیدہ فکر شاعر ہیں۔ ان کی کتاب تجاوز تحیرات کے ایسے ایسے در کھولتی دکھائی دیتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ غلام حسین ساجد کی سوچ ایک ہی وقت میں کائنات کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کرنے میں محو ہے۔ ہر بات کو یادداشت کے پنوں میں ثبت کر کے جب اسے چاہیں الفاظ کی صورت میں ڈھال کر اوراق کی زینت بنانے کی اہلیت سے مالا مال ہیں۔

ان کی فکری وفنی جہات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک ایسی قوسِ قزح وجود میں اتی ہے جو افقِ ادب پر ہمیشہ جلوہ افروز رہے گی۔ ان کی بصیرت جامد تصورات کی آئینہ دار نہیں بلکہ ان کے خیالات کا تنوع انھیں کثیر الزاویاتی انداز سے دیکھنے کا فن عطا کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ان کے تخلیقی نظریات مقامی نہیں بلکہ آفاقی ہیں۔ وہ روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ نئے امکانات پیدا کرنے کے لیے تخلیقی زمین ہموار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر رجائیت پسند ہیں ان کی شاعری میں رومانی کیفیات اور متصوفانہ تصورات بغل گیر نظر آتے ہیں۔ مثلاً

مختلف میری بصیرت سے نابینائی الگ
ہے وہی آئینہ خانہ ، کارفرمائی الگ

.....

اس کے آنے سے مکمل ہو گیا میرا وجود
ہو گئی میرے بدن سے میری تنہائی الگ

.....

محبت مضبوطی بھی ہے کمزوری بھی اس لیے کسی کے ساتھ ہونے کا تصور انسان کو مضبوط بناتا ہے مگر اس کے کھو جانے کا خوف انسان کو کمزور بنا دیتا ہے اور انسان محبوب کو نگاہِ زمانہ سے اس طرح چھپا کے رکھنا چاہتا ہے کہ سوائے اس کے کوئی اور اس کے روشن چہرے کا طواف کرنے کی جرات نہ کر سکے۔ محبت میں فطری طور پر قابض ہونے کا انداز غلام حسین ساجد کی شاعری میں بپھرے ہوئے دریا کی مانند ہے جس کا ہر ایک ریلہ احساسِ قرب کے خمار میں ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ محبوب کو پوشاکِ عشق میں ڈھانپ کر اہلِ دنیا سے چھپانے کا خواہش مند بھی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

قریب لا کے اُسے، حرزِ جاں بنا کے اُسے
مگر رکھوں گا بھرے شہر سے بچا کے اُسے

.....

بتا رہا تھا مجھے ، ٹوٹتا بدن اُسکا
پسند آئے ہیں تیور میری خطا کے اُسے

.....

غلام حسین ساجد نے اپنی شاعری میں ہجر و وصال کو نئے انداز میں شامل کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عشق و محبت میں ہجر و وصال اہمیت کے حامل ہیں اور ازل سے ہی شاعری میں شامل ہیں۔ مگر شاعری میں ان فطری موضوعات کو بیان کرنے کا انداز نیا نہیں ہے۔ پروین شاکر کے خوشبو میں مہکے مہکے شکوے، احمد فراز کا اندازِ غمِ جاناں یا اسی قبیل کے دیگر شعرا کی شاعری میں یہ موضوعات نمایاں رہے ہیں۔

غلام حسین ساجد بھی اسی قبیل کے شاعر ہیں مگر ان موضوعات کو بیان کرنے کا انداز الگ ہے۔ اور یہی انداز ان کی انفرادیت بھی ہے۔ اس انفرادی انداز کو ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے جہاں ہجر میں بھی ایسی ریاضت ہے کہ وصل کا گماں ہجر کی حقیقت پر غالب ہے۔ اور رنگِ عاشقی میں اپنی برتری کو محبوب کے سامنے عاجزانہ انداز میں پیش کر کے غلام حسین ساجد نے اظہارِ ذلت کا ایک نیا رخ ظاہر کیا ہے:

اس کے قریب تو نہیں پھر بھی وہی کہیں ہیں ہم
جاگے ہوئے نہیں اگر، سوئے ہوئے نہیں ہیں ہم

.....

لاکھ جتن کیے مگر ان کو نہیں منا سکے
آج یقین آ گیا عرش ہے وہ زمیں ہیں ہم

.....

غلام حسین ساجد کی شاعری میں رومانیت، احساسِ ہجر و وصال، عشق و محبت، اور انسانی عظمت جیسے موضوعات شامل ہیں۔

شعری رموز پر دسترس کی وجہ سے الفاظ کا چناؤ قابلِ تحسین اور لائقِ ستائش ہے۔

اللہ رب العزت ان کی ذہنی فکر کو مزید دوام بخشے اور مشاہدہ کرنے کی توفیق اپنی رحمت سے عطا فرمائے تا کہ؛ تجاوز؛ جیسے ادبی گُل کھل کر گلشنِ ادب کو معطر و تازہ رکھیں۔

☆☆☆☆☆

سلطان رشک اور گوجر خان

5 دسمبر 2023 دبستان راولپنڈی کے لیے غم و اندوہ کا دن تھا کہ اس روز وہ شخص دنیائے فانی سے رخصت ہوا جس نے کئی دہائیوں تک راولپنڈی کی ادبی فضا میں تلاطم برپا کیے رکھا، غالباً 05-2004 کی بات ہے جب لیاقت روڈ پر گورڈن کالج کے سامنے انتر ائی میں پی ایم اے ہاؤس کے ساتھ ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' کے دفتر میں سلطان رشک سے ملاقاتوں کا آغاز ہوا اور پھر کم از کم پانچ سال تسلسل کے ساتھ کبھی نیرنگ خیال اور کبھی کسی ادبی تقریب میں سلطان رشک سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، اسی پہلی ملاقات میں مجھ سے قبل برادرم شکور احسن بھی سلطان رشک کے پاس تشریف فرما تھے سو ان سے محبت اور دوستی کا رشتہ بھی وہیں پروان چڑھا، شام چار بجے کے لگ بھگ سلطان رشک دفتر آتے تو میں بھی پہنچ جاتا، چائے کے ادوار چلتے، ادبی گپ شپ ہوتی، میں نیرنگ خیال کی ترسیل اور تیاری میں تھوڑی بہت معاونت بھی کر دیتا، جس کا ذکر انھوں نے کسی سالنامے میں بھی کر رکھا ہے، میں یہاں بتاتا چلوں کہ اردو شاعری کی اصلاح پہلے پہل سلطان رشک اور پھر سید عارف (مرحوم) سے لی لیکن دیگر جز وقتی شاعروں کی طرح اس میدان میں کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دینے سے قاصر رہا اس لیے اب شاعری پہلی ترجیح نہیں رہی، نیرنگ خیال کی ان ملاقاتوں میں کبھی کبھار عمران عامی، احمد رضا راجا، مختار مغل صائم، ارشد نذیر ساحل، عباس ثاقب، صابر ملک بھی شریک ہو جاتے، سینئر شعرا میں شوکت مہدی، سید عارف، کرنل مقبول حسین وغیرہ تو اکثر آتے جاتے رہتے، 2009 میں ''گوجر خان میں اردو نعت گوئی'' کے زیر عنوان ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے کوائف جمع کرنا شروع کیے، کتاب کے لیے ایک باب ان شاعروں اور ادیبوں کے لیے بھی مختص کرنے کا ارادہ تھا جو گوجر خان سے تو نہیں تھے لیکن بسلسلہ ملازمت یا کسی اور وجہ سے کسی نہ کسی دور میں گوجر خان قیام پذیر رہے، سلطان رشک بھی چونکہ زندگی کے چند ابتدائی سال گوجر خان گزار چکے تھے اس لیے 21 ستمبر 2010 بروز بدھ شام 6 بجے نیرنگ خیال کے دفتر میں

فیصل عرفان

ہی ان سے سوانحی کوائف حاصل کیے اس ملاقات میں ان کا معاون شاہد ساکن دھیر کوٹ آزاد کشمیر بھی موجود تھا، کتاب تو بوجوہ شائع نہ ہوسکی لیکن سلطان رشک سمیت بہت سے شاعروں ادیبوں کے کوائف اسی بہانے جمع ہوگئے، سلطان رشک کا اصل نام سلطان احمد تھا، اجمیری گیٹ دہلی میں 10 اپریل 1943 کو شیخ برادری کے عبدالمجید کے گھر پیدا ہوئے، پانچ بھائیوں خورشید عالم، محمد سرور، شمیم احمد، اخلاق احمد اور چار بہنوں میں آپ کا نمبر پانچواں تھا۔ عبدالمجید پاکستان آمد سے قبل لکڑی کا کاروبار کرتے تھے، پاکستان قائم ہوا تو خاندان کے ہمراہ پہلے لاہور اور پھر گوجر خان منتقل ہوئے، سلطان رشک نے اسلامیہ سکول گوجر خان سے 1954 میں پرائمری پاس کی، عدالت حسین سکول ٹیچر اور نتھو خان سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، 1957 میں والد کا انتقال گوجر خان میں ہی ہوا اور اس کے بعد یہ خاندان راولپنڈی منتقل ہوگیا، فیض الاسلام ہائی سکول ٹرنک بازار سے 1959 میں میٹرک کیا، گورنمنٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی سے 1961 میں ایف اے کیا، کالج یونین کے سیکرٹری بھی رہے، ایف اے کے طالبعلم تھے جب شاعری کا آغاز کیا، 1961 میں پہلی غزل لکھی جس کا مطلع یہ تھا

ان کی محفل میں کہاں جرات گویائی ہے
دل کی ہر بات نگاہوں میں سمٹ آئی ہے

.....

گورڈن کالج راولپنڈی سے 1964 میں بی اے اور 1966 میں اسی کالج سے اردو ادب میں ایم اے کیا، ایم اے کے کلاس فیلوز میں پروین فنا سید، رشید امجد اور اسد منظور ہاشمی تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد گورڈن کالج راولپنڈی میں بطور لیکچرار 3 ماہ ملازمت بھی کی، حکیم یوسف حسن کی زندگی میں ہی 1967 میں برصغیر کے قدیمی ادبی رسالے ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' کی ادارت سنبھال لی تھی، نیرنگ خیال میں برصغیر پاک و ہند کے تمام نامور شعرا اور ادیبوں کی نگارشات تسلسل سے شائع ہوتی رہی ہیں، شاعری میں فوق لدھیانوی سے مشاورت کرتے، پہلے سلطان احمد قریشی تخلص کرتے تھے پھر جوش ملیح آبادی کے کہنے پر سلطان رشک لکھنے لگے، اختصاص اردو غزل تھا اور اہم ادبی دوستوں میں ضمیر جعفری، عبدالحمید عدم، کرنل محمد خان شامل تھے، طنز و مزاح پر مبنی رسالے ''اردو پنچ'' کے بھی مدیر رہے 1974 میں والدہ کی مرضی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے، سلطان رشک کا اولین شعری مجموعہ ''دریا کی دہلیز'' تھا بعد ازاں ''کاغذ کا گھر'' کے نام سے دوسرا شعری مجموعہ بھی شائع ہوا، 2004 میں نمل اسلام آباد سے سمیرا حبیب نے ''سلطان رشک کی شاعری دریا کی دہلیز کے حوالے سے'' کے موضوع پر ایم اے اردو کا مقالہ تحریر کیا جسکے نگران پروفیسر احمد جاوید تھے، لیاقت روڈ پر نیرنگ خیال کا دفتر کئی دہائیوں تک ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا، صدر جی پی او کے سامنے شیزان ہوٹل میں سلطان رشک کی معیت میں سید عارف، شوکت

مہدی، کرنل سید مقبول حسین جیسی ادبی شخصیات روزانہ مغرب کے بعد محفلیں سجاتے جو کئی گھنٹے تک جاری رہتیں، کئی سال قبل فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے لیکن اسے مجبوری نہ بنایا اور علالت کے باوجود باقاعدگی کے ساتھ نیرنگ خیال کی اشاعت کا اہتمام کرتے رہے۔ نیرنگ خیال پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام کتب کی اشاعت اور بزم نیرنگ خیال کے زیرِ اہتمام ادبی تقریبات کا انعقاد کرتے تھے۔

سلطان رشک افراتفری کے دور میں بھی حالت کے بہتر ہو جانے کے بارے میں بہت پرامید رہے، انہیں یقین تھا کہ تاریکی بہت جلد ختم ہونیوالی ہے اور ہر طرف صبح کی روشنی نے پر پھیلانے ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یقین ہے روشنی، صبح کا مجھے اے رشک
ہوں منتظر مرے دن رات کب بدلتے ہیں

ہمیں معلوم ہے جانبر نہیں ہونا مگر پھر بھی
تمنا کا قدم امید کے زینے میں رہنے دے

امید کا جادو بھی بہت خوب ہے لیکن !
میں خوفِ شبِ تار و سحر میں نہیں رہتا

پرندے چہچہانے ہیں، سحر ہونی ہے گلشن میں
مجھے پورا یقیں ہے یہ اندھیرا ختم ہونا ہے

سایۂ خورشید محشر میں ہوں، اس امید پر
اس سفر میں سایۂ ابرِ رواں بھی آئے گا

ملک میں عدل وانصاف کی عدم فراہمی پر آپ ہمیشہ کڑھتے رہتے، اپنے اردگرد برپا ناانصافی اور جبر دیکھ کر سلطان رشک کو کسی طور چین نہیں پڑتا تھا، اپنی دلی کیفیات کا اظہار وہ اشعار میں یوں کرتے تھے۔

اِک عدل ہی نایاب تھا بس شہر میں تیرے
منصف بھی تھے، مجرم بھی، کٹہرے بھی بہت تھے

نظامِ عدل، محرومِ سماعت اور بصارت ہے
بہت کرتی رہی خلقِ خدا فریاد پہلے بھی

اپنے نظامِ عدل کے بارے میں کیا کہوں
مجرم یہاں گناہ سے آگے نکل گئے

پھول ہیں نغمے ہیں، رنگ ونور ونکہت ہے مگر
لے اڑا اس سلطنت سے عدل کی میزان کون

....

سلطان رشک نے کبھی اصولوں پر سودے بازی نہیں کی اور نہ ہی لالچ اور مالی فائدے کے عوض اپنے فرائض سے کوتاہی برت کر دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی، سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ لکھنا انکا طرہ امتیاز رہا، یہ اشعار ان کی اسی روش کی عکاسی کرتے ہیں۔

دستِ ستم کو دستِ مسیحا نہیں لکھا
میں نے منافقوں کو فرشتہ نہیں لکھا

تمہاری طرح جو کرتے منافقت کو قبول
کبھی نہ طبعِ زمانہ پہ ہم گراں ہوتے

سلطان رشک فن ہو جہاں مصلحت کا نام
اس دورِ ناسپاس میں مر جانا چاہیے

ہم اہلِ دل کا تعلق ہے زیرِ دستوں سے
ہم اہلِ زر سے کوئی ساز باز رکھتے نہیں

مفاہمت ہی نہ کر پائے اہلِ دُنیا سے
ہم اپنے کام کو خود ہی محال کرتے رہے

.....

سلطان رشک اپنی انا اور خودی کی حفاظت جان سے بڑھ کر کرتا تھا، اس نے کبھی اپنی انا کو مجروح نہیں ہونے دیا اور انا کے پرچم کو ہمیشہ سر بلند رکھا، انا سلطان رشک کی غزل کا اہم جزو تھا جسے اس نے خوبصورتی سے اپنے شعروں میں بیان کیا ہے۔

ہم اہلِ انا دل کی حکایت کسی سے
کہتے تو کسی ڈھنگ سے توقیر سے کہتے

انا کو قتل ، وفا کو وقار ہوتا ہے
ہم ایسے لوگوں کے حالات کب بدلتے ہیں

ہم اہلِ انا، مر تو سکتے ہیں لیکن جھکیں گے نہیں
میرے دریا، رضا تیری کیا ہے بتا، تشنگاں کے لیے

بس ایک کام نخوردہ گزند کرتے رہے
تمام عمر انا کو بلند کرتے رہے

ٹکرا نہ مجھ کو میری انا کے پہاڑ سے
میرے لیے وہ ساعتِ برہم طلب نہ کر

.....

سلطان رشک تمام عمر دوستوں سے شاکی بھی رہے اور خائف بھی، اسی لیے ان کی شاعری میں اس حوالے سے جا بجا اشعار ملتے ہیں۔

مجھے قریب کے لوگوں سے خوف آتا ہے
چھپے ہوئے مرے دشمن یہیں کہیں ہیں بہت

ساحل پہ دوستوں نے کرم یوں کیے کہ ہم
اِک بار پھر کشاکشِ دریا میں آ گئے

کس سے امید وفا رکھیں یہاں سلطان رشک
اب تو یاروں کی محبت پر گماں کچھ اور ہے

دشمنوں نے تو عدالت میں گواہی دی سودی
دوستوں کا بھی پسِ پردہ بیاں کچھ اور ہے

جو کام میرے عدو کر نہ پائے رشک وہی
بصد خلوص میرے درد مند کرتے رہے

.....

سلطان رشک کی غزل میں محبت کے لطیف جذبات کا اظہار بہت سی جگہوں پر نظر آتا ہے، وہ ظلمت کی تاریکیوں میں اپنی محبت کو اِک چراغ سے تشبیہ دیتے ہیں، انکا جینا اور مرنا محبت کے حوالے سے تھا، محبت کے بغیر وہ اپنی زندگی کو نامکمل تصور کرتے تھے۔

دنیا میں نہیں کچھ بھی محبت سے زیادہ
ہوتی ہے محبت تری قربت سے زیادہ

جلا ہی رہتا ہے دل میں دیا محبت کا
یہ نور ، خیمہ ادراک میں نہیں رہتا

تنہا کھڑا ہوں دیر کی ظلمت کے سامنے
میرا چراغ تیری محبت کا جام ہے

جینا بھی محبت ، مرا مرنا بھی محبت
کیا زیست محبت کے حوالے سے نہیں ہے

جو تیری عطا تیری رفاقت سے ملا تھا
رہتا ہوں اسی سحر محبت کے اثر میں

☆☆☆☆☆

نیلے پانیوں کے کنارے

صبح جب نیلے پانیوں کی جانب سفر شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے نیلگوں آسمان سے پانی برسانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے ہماری توجہ راستے سے زیادہ گاڑی کے شیشے پہ اُبھرتی اور پھیلتی ہوئی دُھند کی طرف مبذول رہی۔ اِسی کشمکش میں خیال آیا کہ موسمیاتی حالات کے مطابق راستے اور منزل کے بارش کے حد درجہ اِمکانات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے خوشگوار موسم کی دُعا تو رات کو سفر سے پہلے ہی کر لی تھی پھر شیشے پہ اتنی دُھند کیوں؟ اس سے پہلے کہ شیطان اور بہکاتا یاد آیا کہ کیپٹن کرنل شیر خان نشانِ حیدر اِنٹرچینج تک دُعا میں رم جھم کی گنجائش رکھی تھی۔ اِسی اثنا میں ماونوریاسر نے اپنا موبائل فون میرے کان کے قریب لا کر گوگل کی مدد سے گاڑی کے شیشے پر موجود دُھند کو قابو میں لانے کی ہدایات سُنائیں جو کہ پُراثر ثابت ہوئیں۔ ابھی دُھند کا مسئلہ حل ہوا ہی تھا اچانک نظر آیا کہ ڈرائیور سائیڈ والے وائپر کے بلیڈ کا ٹکڑا اپنے راڈ سے جُدا ہو چکا ہے۔ اِس مسئلے کا ادراک ہوتے ہی سب سے پہلے خیال میں ڈرائیور کی غلطی نظر آئی جس نے صبح صبح گاڑی کی مکمل فٹنس کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن اُسی لمحے تصدیق نہ کرنے کی اپنی غلطی کا بھی احساس ہوا۔ اِس بات کی اطلاع فون پر اگلی گاڑی میں رَواں ٹرپ لیڈر کرنل آصف محمود (مخلص اور انسان دوست شخصیت) کو دی جس پر اُنھوں نے ہدایت دی کہ پشاور موٹروے پر واقع ''ہکلا'' ریسٹ ایریا پہنچ کر مدد حاصل کی جائے گی۔ ریسٹ ایریا میں میرے پٹھان مستری دوست نے چستی اور خندہ پیشانی سے ربر نکالنے کے بجائے پُورا وائپر نکالا اُس سے مجھے اُن کی وائپر ربر لگانے کی مہارت کا اندازہ ہو گیا جو کہ دُرست ثابت ہوا اور اُس کے نتیجے میں مستری وہ کام آدھے گھنٹے میں بھی نہ کر پائے جو دو یا تین منٹ میں ہو جانا چاہیے تھا۔ اِس ناکامی کے احساس کو خوشگوار کامیابی کے احساس میں بدلنے کے لیے ہم سب نے اگلے سفر کے لیے تازہ دم ہونے کے آپشن کا بھرپور فائدہ اُٹھایا اور کٹے ہوئے وائپر کے ساتھ ہی سفر جاری

حسن یاسر ملک

رکھا۔ خوشی اِس بات پہ ہوئی کہ حسن ابدال انٹرچینج سے پہلے ہی رم جھم بھی رُک گئی اور میں نے اچھے مسلمان کی طرح وائپر کی تبدیلی کی ناکامی کو بھی اللہ تعالیٰ کی بہتری سمجھ لیا۔ سفر کے شروع میں اور اختتام تک سب سے زیادہ میری نظریں جس کی متلاشی تھیں وہ حروف اور گنتی کے الفاظ کے مجموعہ اے بی وائے 399 تھے۔ جو کہ ٹرپ لیڈر کی سفید کار پر لکھے ہوئے تھے۔ نیلے پانیوں کے کنارے کا سفر چونکہ 8 ستمبر کو شروع ہوا تھا۔ اِسلئے موسم کے لحاظ سے دریائے سندھ کو عبور کرتے ہوئے اباسین کے پانی کو نیلگوں ہی پایا۔ زندگی میں ایسا صرف دوسری بار ہوا تھا کہ میں نے دریائے سندھ کو موٹروے پر عبور کیا تھا۔ اِس تصور میں میں نے ہمیشہ کی طرح اپنے آپ کو اٹک خورد میں دریائے سندھ کے پُل پر پایا۔ موٹروے کے پُل پر مجھے دریائے سندھ میں وہ جوش ولولہ نظر نہ آیا جو اٹک خورد میں محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اِس کی وجہ دریائے کابل کی غیر موجودگی کو ہی جانا۔ اور اپنی وجہ سے ٹرپ لیڈر نے وہاں رُک کر فوٹو بنانے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ میری اکلوتی بیگم صاحبہ کے گاڑی کی رفتار کو قابو میں رکھنے کی ہدایت اور سیکنڈ سیٹر ہونے کے باوجود ایک غیر مرئی بریک پیڈل دبانے کے احساس نے ایک دفعہ پھر مجھے اے بی وائے 399 کا متلاشی بنا دیا۔ بے شک بارش کے باوجود بہت دُور کے نظارے بھی حدِ نگاہ میں تھے لیکن پتہ نہیں باقی گاڑی والوں کو کیا جلدی تھی کہ وہ مجھے دائیں بائیں نظاروں کو دیکھنے کا زیادہ موقع نہیں دے رہے تھے اس لیے پچھلی سیٹ پر سائیڈز میں بیٹھی دو بیٹیوں اور سیکنڈ سیٹ پر براجمان بیگم صاحبہ نے کیمرا کی مدد سے میرے لیے تصویریں بناتے ہوئے مجھے سڑک پر توجہ مرکوز رکھنے کی ہدایت دیتے ہوئے اِس بات کا احساس دلایا کہ وہ کسی بھی وقت لاہور میں موجود میری والدہ صاحبہ کو فون پر گاڑی کی تیز رفتاری کی اطلاع دے سکتی ہیں۔ میں مشکور ہوں ٹرپ لیڈر کا جنھوں نے اپنی عادت کے تحت گاڑی کو ہمیشہ حد رفتار سے تھوڑا اُوپر ہی رواں رکھا جس کی وجہ سے مجبوراً مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ مجھے جلدی تھی کہ میں جلد از جلد'' کیپٹن کرنل شیر خان شہید'' کو خراج عقیدت پیش کروں۔ کیپٹن کرنل خان شہید انٹرچینج سے سوات کے طرف ہمارے ٹرپ لیڈر کی فیملی کا سفر پہلی مرتبہ نہ تھا اس لیے انھوں نے کہیں رُک کر فوٹو گرافی کرنے کو اہم نہ جانا اور جس کی وجہ سے ہم کسی پہاڑ، پیپل کے جنگل یا سرنگ کے ساتھ کہیں تصویر نہ بنا سکے اور نہ ہی ایمان یا سر اپنے ڈی ایس ایل آر کیمرہ جو کہ اِس ٹرپ کیلئے حاصل کیا گیا تھا اس کا کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکی۔

''چکدرہ'' کے قریب پیپل کے گھنے جنگل مجھے 1958 کی یاد دلاتے رہے کہ جب ہم اپنے والد بریگیڈیئر حسن اختر ملک (مرحوم) کے ساتھ پہلی مرتبہ نوشہرہ چھاؤنی سے نیلے

رنگ کی جیپ میں سوات آئے تھے۔ ماضی کے سفر جس میں میں نے اپنے والد، والدہ اور بھائی (حسن شیر یار ملک) کی یاد میں محو رہا۔ اِس وقت میری نگاہ سامنے تھی جبکہ میری بیگم صاحبہ اور بیٹیاں مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں یا اُن کو قلمبند کرنے میں مصروف تھیں اس لیے مجھے میں چکدرہ انٹر چینج پر پہنچ کر پتا چلا کہ ہم سلور رنگ کی اے بی وائے 399 سے ٹکرانے والے تھے۔ بے شک اے بی کے 091 پیچھے تھی لیکن ذمہ داری تو پھر بھی ٹرپ لیڈر کی تھی ویسے بھی صاحب تو غلط ہو ہی نہیں سکتے۔ چکدرہ سے شمال مشرق کی طرف سفر کے دوران سڑک کے دونوں جانب لگے پیپل کے درخت اور اُن کے ساتھ بہتا چشمہ، بائیں تھوڑا دور نیلے پانی والے دریائے سوات، باغات اور پہاڑوں 1985 کی یادیں ایسی سحر انداز ہوئیں کہ وہ پیپل کے درخت جو بٹ خیلہ سے کم ہونا شروع ہوئے تھے اور قبضہ تھانہ تک ختم ہو گئے تھے میرے ساتھ ساتھ بریکوٹ تک رہے۔

بریکوٹ سے مینگورہ پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک دریائے سوات کی دائیں اور دوسرا دریائے سوات کے بائیں جانب خواتین کی ہمراہی کے مدِنظر ٹرپ لیڈر نے پرانے راستے کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ راستے کے اختیار کے بعد عازمِ سفر ہوئے ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ دریا کے کنارے رؤ (گنے کا رس) اور چھلی والا نظر آیا۔ دوپہر ہو چکی تھی اور بھوک بھی چمک رہی تھی تو اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ ہلکا پھلکا کھا لیا جائے کیونکہ لنچ مینگورہ میں کرنا تھا۔ خواتین کی دُگنی تعداد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مونث چھلیاں کھائی گئیں اور مذکر پھٹوں کو چھوڑ دیا گیا اور سفر کو جاری رکھتے ہوئے ہم مینگورہ پہنچ گئے۔ یہ تو وہ مینگورہ ہی نہیں تھا جہاں سے میں 35 سال پہلے دو تین مکانوں اور دُکانوں سے گزرا تھا۔ یہ والا مینگورہ تو ایک دریائے سوات اور پہاڑی سلسلوں کے درمیان ایک پروپا ہوا پورا شہر تھا جو کہ ایک تنگ گزرگاہ بن چکی تھی۔ میں سلام پیش کرتا ہوں۔ خیبر پختونخواہ کی ٹریفک پولیس کو جو کہ نہایت تندہی اور فرض شناسی سے ٹریفک کو رواں دواں رکھے ہوئے تھے۔ اگر ٹرک آپ کو لیڈ کر رہے ہیں تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ رکشہ اور سوزوکی پک اپ کی اچانک بغیر انڈیکیٹر یُو ٹرن لینا اُن ہی کی مہارت کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں اور سیاح ڈرائیور حضرات کو اِس مہارت سے بچنا چاہیے۔ مینگورہ میں بزرگ تو کیا بچے بھی اتنے بہادر ہیں کہ ایک دم گاڑی کے آگے آ کر آپ کا ڈرائیونگ ٹیسٹ لیتے رہتے ہیں اور آپ کی ناراضگی اور جُرأت کے اظہار کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہماری گاڑی راجہ بازار راولپنڈی یا بھٹہ چوک لاہور سے گزر رہی ہے۔ جب پولیس والے نے اطلاع دی کہ کورونا بیماری کے باعث تمام ریسٹورانٹ بند ہیں تو بھوک کے ساتھ ساتھ تھکاوٹ کا احساس جاگنے لگا۔ چنانچہ میرے پُرزور اِصرار

پر فضا گھٹ کے مقام پر نیلے دریائے سوات کے کنارے فروٹس کھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ میرا مقصد تو دریائے سوات میں تیراکی کرنے کا تھا اس لیے مجھے کھانے کی پریشانی نہیں تھی لیکن ٹرپ لیڈر نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے مچھلی والے کو ڈھونڈ لیا پھر مجھ سے مشورہ کیا۔ میرا دھیان نیلے پانی کی طرف تھا اس لیے میں نے دونوں کانوں سے مشورہ سنتے ہوئے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی اور دریا کی طرف بھاگ پڑا اور اس سے پہلے کہ کوئی ممانعت یا ہدایت کے بارے میں بتاتا میں جوش کے ساتھ نیلے پانی میں اُتر گیا۔

جب میں نے گردونواح کا جائزہ لیا تو ''فضا گھٹ'' کی لوکیشن، ڈولی (دریا پار کرنے کے لیے لوکل چیئر لفٹ) اور کچھ کھیت دیکھ کر یاد آیا کہ یہ تو وہی جگہ ہے جہاں میں پہلی دفعہ اپنے والد (مرحوم) کے ساتھ آیا تھا جنھوں نے میری تیراکی کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی اور یہیں پکنک کے دوران امی جان کے جہیز والے واٹر سیٹ کا ایک گلاس بھی دریا میں کھویا تھا۔ یادوں سے نکل کر دیکھا کے سمن یاسر کی قیادت میں ایمان آصف، احمد آصف، ماہ نور یاسر اور ایمان یاسر دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے جبکہ ٹرپ لیڈر نہایت مخلصانہ طور پر کھانے پکوانے کی ذمہ داری سرانجام دیتے رہے۔

اس سے پہلے کہ ہم مچھلی کھانے کے بعد وہاں سے روانہ ہوتے، ڈھول والوں نے ہمیں الوداعی سلام پیش کیا جس سے بچے بہت محظوظ ہوئے۔ ہماری اگلی منزل ''ملم جبہ'' جسے عُرف عام میں ''مالم جبہ'' کہتے تھے اور ہم وہاں نماز عصر تک پہنچنا چاہتے تھے تاکہ نہ صرف ملم جبہ کے حسین نظاروں سے زیادہ سے زیادہ محظوظ ہو سکیں بلکہ بچوں کی خواہش کے مطابق کرکٹ بھی کھیل سکیں۔ ملم جبہ پہنچنے کے لیے ہم پہلے ''منگلور'' پہنچے جہاں سے شمال کی جانب تین گھنٹے کے فاصلے پر کالام ہے جو کہ ہماری آخری منزل تھی اور منگورہ سے مشرق کی جانب ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر 9199 فٹ بلندی پر ''ملم جبہ'' ہے۔

اِس سے پہلے کہ ''ملم جبہ'' کی بلندیوں کی جانب عازم سفر ہوں کچھ سوات کے جغرافیہ اور تاریخ کے بارے میں بات ہو جائے۔ جغرافیائی اعتبار سے سوات کوہ ہندوکش سلسلے کی ایک وادی ہے جو دریائے سوات کے دونوں اطراف جنوب میں چکدرہ سے شمال میں شندور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی لمبائی 150 کلومیٹر ہے جب کہ اس کا کُل رقبہ 5337 مربع کلومیٹر ہے۔ یہ حسین وادی بہت سی نیلگوں جھیلوں، جنگلوں اور پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ وادی سوات کے مشرق میں کوہستان کی مشہور علاقے ''بشام اور پتن'' واقع ہیں اور اس کے مغرب میں ''دیر روش اور کمراٹ'' جیسی حسین وادیاں موجود ہیں۔

تاریخی لحاظ سے 2000 سال پہلے اس وادی کا نام عدیانہ تھا جو بعد میں ''سُواستو'' بھی کہلایا۔ 1001 سنہ عیسوی میں افغانستان

سے آئے ہوئے محمود غزنوی نے اس پر قبضہ کیا 1919 میں یوسفزئی ریاست سوات کی بنیاد رکھی گئی اور اِسطرح میاں گل عبدالودود بادشاہ صاحب وادی سوات کے پہلے والی مقرر ہوئے۔ 1969 میں اِس علاقے کے غیور مسلمانوں اور والی سوات جہانزیب صاحب نے مغربی پاکستان کے ساتھ الحاق کرلیا۔ وادی سوات کا دارالخلافہ سیدو شریف تھا جہاں پر ابھی ایک ہوائی اڈہ بھی قائم ہے جو کہ پشاور سے آدھے گھنٹے کی اُڑان پر واقع ہے۔ ''سیدو شریف'' سے ''مٹلم جبہ'' کا فاصلہ 50 کلومیٹر ہے۔ یہ جان کر کہ ''مٹلم جبہ'' کو وادی سوات میں گرمیوں کے دربار ہونے کی حیثیت حاصل ہے مٹلم جبہ میں ہماری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ انواع واقسام کی گاڑیوں کو اُوپر جاتے ہوئے دیکھ کر یہ اُمید پیدا ہوئی کہ اے بی کے 091 جو کہ 2016 ماڈل جی ایل آئی کار آسانی سے مٹلم جبہ پہنچ جائے گی۔ مٹلم جبہ کی طرف روانہ ہوئے تو دائیں طرف ایک نالہ بہہ رہا تھا جس میں پانی تو کم تھا لیکن پتھر بہت بڑے بڑے تھے اور کنارے کے ساتھ والے پتھر تو اتنے بڑے تھے کہ اُن پر لمبے لمبے درخت بھی اُگے ہوئے تھے۔ جُوں جُوں ہم اُونچے ہو رہے تھے نالہ گہرا ہوتا جا رہا تھا راستے میں سڑک کے کنارے درختوں پر آلو بخارے اور سیب دیکھ کر خوشبو اور ذائقے کے احساسات اُجاگر ہوئے مگر تھوڑی دیر کے بعد جب یہ پتہ چلا کہ نہ وہ آلو بخارے ہیں اور نہ ہی سیب بلکہ وہ تو جاپانی فروٹ ہیں تو حیرت کا احساس باقی دو احساسات پر حاوی ہو گیا۔ تازہ ہوا کے جھونکے اور بادلوں کی ٹکڑیاں سفر کو مزید محسور کُن بنا رہی تھیں۔ سڑک کی گہرائی والی سائیڈ پر نیلم ویلی کے برعکس پروٹیکشن وال موجود تھی جس کی وجہ سے میری فیملی اپنے آپ کو کافی محفوظ سمجھ رہی تھی اور میری بیگم صاحبہ کو نیچے وادی کے مناظر کے دیکھنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ آدھے راستے میں ایک گاؤں کو ایسے منصوبہ بندی سے رنگ کیا گیا تھا کہ وہ سبز درختوں میں ایک ''قوس قزاح'' کی طرح نظر آ رہا تھا۔ چار باغ کے پائین فارسٹ میں رنگین چارپائیاں اور جھنڈیاں لگا کر چھوٹی چھوٹی دکانوں کو سیاحوں کے لیے خوب سجایا گیا تھا جو کہ سبزے کے ساتھ ساتھ خوشگوار مناظر پیش کر رہی تھیں۔ راستے میں چھوٹے بچوں کی ٹولیوں سے ہم نے تازہ ناشپاتی اور تازہ تازہ جامنی رنگ کے انجیر بھی خریدے جو ذائقے میں میٹھے اور رس سے بھر پور تھے۔ سیلفی اسٹک کو مدینہ ہوٹل کی پُر خطر سیڑھیوں کو سر کر کے چھت پر جا کر استعمال کیا گیا جو کہ سفر میں آخری استعمال ثابت ہوا۔ منزل کے قریب بادلوں نے ہمیں گھیر لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ برس نہیں رہے تھے بلکہ صرف اور صرف ٹھنڈک اور تازگی کا احساس دلا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ارد گرد اِن بادلوں کے سوا کچھ اور موجود نہیں ہے، سوائے بادلوں کے۔ بعد میں جب بادل

چھٹنے شروع ہوئے تو ملم جبہ کا دلفریب قدرتی حسن نکھر کر سامنے آ گیا ستانے کے بعد ہم لوگ کرکٹ اور باسکٹ بال سے بھی محظوظ ہوئے۔ بیٹر ٹو مارو کا تازہ شمارہ پڑھ رہا تھا کہ سب کے اصرار پر ہم سیر کے لیے روانہ ہو گئے۔ سورج ڈھل رہا تھا، بازار اور ہوٹلز نہ صرف خوبصورت و رنگین منظر پیش کر رہے تھے پی سی ملم جبہ کو دیکھ کر خوشی کا احساس بھی ہوا جو کہ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اسے دیکھ کر اسلام آباد کی روشنیاں یاد آ گئیں جو کہ ہم سے کوسوں دور تھیں۔ قریب ہی موجود سکی ریزارٹ اور چیئر لفٹ ایک دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ مجھے یہ پڑھ کہ حیرت ہوئی کہ سب سے پہلے آسٹریلوی ایمبسڈر جو کہ والیِ سوات کے دوست تھے انہوں نے 1962 میں سکی ریزارٹ کا آئیڈیا دیا تھا۔ گیسٹ روم کی انتظامیہ نے رات کے کھانے میں باربی کیو کا آپشن دے کر ہمارے بھوک اور خوشی میں مزید اضافہ کر دیا۔ ابھی ہم باربی کیوا کا انتظار کر ہی رہے تھے کہ انتظامیہ نے باہر لان میں آگ کا الاؤ جلا کر ہمیں رات دیر تک باہر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

صبح ناشتے سے پہلے ہی گھومنے اور تصویریں بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صبح کی روشنی میں درختوں پر لگے اخروٹ بہت دلکش لگ رہے تھے ۔ ہمارے ٹرپ لیڈر تو پہلے سے ہی اخروٹ شناس تھے لیکن ہمارا یہ پہلا موقع تھا جو کہ میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں 9 ستمبر کی صبح پہلی دفعہ خود اخروٹ توڑ کر ریکارڈ قائم کر لیا۔ ''ملم جبہ'' کے دلفریب نظاروں میں ایک سماجی منظر بھی موجود تھا۔ '' ملم جبہ ''پی سی جیسی پُرشکوہ عمارت کے پہلو میں پہاڑی پتھروں سے بنا ایک چھوٹا سا مکان بہت سارے سماجی پہلو کی طرف توجہ مبذول کروا رہا تھا۔ پتہ نہیں چیئر لفٹ کیوں بند تھی اگر بتائی گئی بارش وجہ تھی تو پھر تو شاید زیادہ تر بند ہی رہتے ہونگے۔ چیئر لفٹ کے بند ہونے کے ملے جُلے رجحان اور ٹرپ لیڈر کے ٹریکنگ کی خواہش جو کہ ایک حُکم کا درجہ رکھتے ہے اُس سے بچنے کی خوشی زیادہ حاوی رہی۔ میں نے وقت ضائع نہ کیا اور مقامی لوگوں سے گپ شپ لگائی تو پتہ چلا کہ ملم نیچائی اور جبہ اونچائی کو کہتے ہیں۔ گوگل سے تصدیق کرنا چاہی تو گوگل نے منہ چڑھا دیا۔ اگر قارئین اور ناقدین میں سے کوئی جانتا ہو تو ضرور بتائیں۔

واپسی کا سفر وہی تھا لیکن دو واضع فرق تھے۔ چونکہ کار پہاڑ والی سائیڈ پر تھی اس لیے بیگم صاحبہ بہت خوش اور پُر اعتماد تھیں۔ دوسرا یہ کہ اُوپر جاتے ہوئے میرا بایاں پاؤں کار کے کلچ پیڈل سے منسلک رہا اور نیچے آتے ہوئے دائیں پاؤں بریک پیڈل سے۔ دوپہر کو ہم واپس منگور پہنچے اور بڑی مہارت سے منگلور کی ٹریفک کو عبور کرتے ہوئے شمال کی جانب اپنی آخری منزل کالام کے لیے عازم سفر ہوئے۔ گوکے مدین میں بھی ٹریفک زیادہ تھی لیکن جو مہارت میں مینگورہ اور خوازہ خیلہ میں

حاصل کر چکا تھا اُس کی وجہ سے مدین سے گزرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ مدین سے گزرتے ہوئے دریائے سوات کا پُرانا لکڑی کا پُل دیکھ کر یادیں تازہ کرنا چاہتا تھا لیکن ٹریفک پولیس والے کے بار بار آگے بڑھنے کے اشاروں نے موقع ضائع کر دیا۔ مدین کراس کرنے کے بعد احساس پیدا ہوا کہ کار میں چوتھا گیئر بھی ہے۔ ٹرپ لیڈر کی اے بی وائے 399 چونکہ آٹو میٹک تھی اس لئے وہ اس فرحت بخش احساس سے دور رہا۔ ''بحرین مدین'' کے شمال میں واقع ایک قصبہ ہے جس کی سب سے پیاری بات یہ تھی کہ وہاں پر ٹریفک کم اور سڑک کھلی تھی جس کی وجہ سے بازار میں دریائے سوات کے کنارے تصویریں بنانے کا موقع مل گیا۔ سفر میں ہم چونکہ دریا کے ساتھ ساتھ تھے اس لیے گہرائی میں ہونے کی وجہ سے مناظر قدرت سے زیادہ لطف اندوز نہ ہو پا رہے تھے۔ کیدم کے مقام پر دریا کے اُوپر ایک لکڑی کا پُل، ایک ڈولی اور دریائے سوات میں گرتا ہوا پہاڑی نالہ دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ دریائے سوات اور پہاڑی نالے کا سنگم مجھے اِس کا حصہ بننے سے نہ روک سکے۔ دریائے سوات کا حصہ بنتے ہی مجھے اِس کے بارے میں تجسس ہوا کہ دریائے سوات کالام میں موجود مغربی دریائے گبرل اور مشرقی دریائے عوشو کے سنگم پر وجود میں آتا ہے اور 240 کلومیٹر کا سفر تہہ کر کے چارسدہ کے مقام پر دریائے کابل کا حصہ بن کر اپنا رنگ کھونا شروع کر دیتا ہے اور قدرت کا خوبصورت نظام دیکھیں کہ اباسین انک خورد کے مقام پر دریائے کابل پر اثر انداز ہونا شروع کر دیتا ہے۔ پہاڑی نالے کو مقامی نالہ کہنے سے بہتر ہے کہ اِس کو کیدم کا نام دے دیا جائے۔ ''کیدم'' اور ''دریائے سوات'' کا پانی ٹھنڈا ہونے کے علاوہ فرحت بخش بھی تھا۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا لیکن گہرائی کم ہونے کی وجہ سے میں نے خوب تیراکی کی۔ آخر کار ٹرپ لیڈر کے کہنے پر خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہم اُوپر سڑک پر آ گئے۔ آتے ہوئے ٹرپ لیڈر کی خواہش پر لکڑی کے پُل پر اُن کی کے لیے تصویر بنائی جو کہ فیس بک پر ڈی پی موجود ہے۔ اسریت ایک تنگ راستہ ہے جہاں پر دریا میں دو منزلہ ٹری ہاؤس ہے۔ اس جگہ پر ہم نے دوپہر کا کھانا اُن چپل کبابوں کے ساتھ کھایا جو کہ ہم بریکوٹ سے ڈھونڈ رہے تھے۔ اسریت سے جلد ہی ہم وادی کالام میں داخل ہو گئے۔ کالام میں ہمارے گیسٹ رومز کی لوکیشن بہت شاندار تھی جو کہ گابل نالے کے کنارے کالام کے جنوب مغربی پہاڑ پر واقع ہے۔

اِس مقام سے پوری وادی کالام، ملحقہ پہاڑی سلسلے نیلے دریائے سوات دریائے گرل اور ''عوشو'' جنگل کا حسین و دلکش منظر فریم میں مقید ہو جاتے ہیں۔

وادی میں پھیلے رنگین مکانات اور مقامی بچوں کے کھیل اور عصر کی اذانوں کی آوازوں کا سحر کا اپنا ہی مزہ تھا۔ پورے دن میں صرف ایک ہی

ذمہ داری تھی کہ شام کو امی جی کو خیریت سے آگاہ کروں اور دن بھر کی تصویریں بھیج سکوں۔ آپ یقین کریں کے اِس ذمہ داری کو پورا کرنے میں 3 جی ٹیکنالوجی نے کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ وادی کبھی بادلوں سے خالی ہو جاتی اور کبھی بھر جاتی۔ بہر حال بادل اپنا دلکش منظر پیش کرتے رہے۔ میں یہ سوچتا رہا کہ رات کو کس جگہ پر کتنی روشنیاں وادی کو جگمگا ئیں گی۔ جب اندھیرا ہوا تو کئی رنگوں کی روشنیوں سے پوری وادی پُرنور ہوگئی۔ جب بچے ۳ جی تلاش رہے تھے اور خواتین کھانے کے بارے میں ہدایات دے رہی تھیں تو میں شمال میں شندور کی طرف پہاڑوں پر برف کو ڈھونڈ رہا تھا۔ نیم شب کی خامشی اور وادی کے رنگوں میں محو رہنے کے بعد کب نیند آ گئی پتہ ہی نہ چلا۔ صبح جب کھڑکی سے باہر دیکھا تو دور شمال میں پہاڑوں پر تازہ تازہ برف دیکھ کر ایک انجانی خوشی نے میرے اندر کو بھر دیا اور میں اپنی اِس خوشی میں سب کو شامل کرتا رہا۔ اِس خوشی میں وادی ایبٹ آباد اور ٹھنڈا پانی پہاڑ کی برف بھی شامل ہے۔ صبح ''عوشو'' جنگل کی سیر کے لیے روانہ ہوئے یہ ایک بہت گھنہ پائین فارسٹ ہے جو کہ تکون شکل میں دریائے گرل اور عوشو کے درمیان وادی کے شمال میں واقع ہے۔ جنگل میں سڑک کنارے چھوٹے بڑے ٹینٹس پر مشتمل ہوٹلز موجود ہیں۔ عوشو جنگل کی تمام تر خوبصورتی کے باوجود زمین پر سبزہ نہ تھا اور اُس کی وجہ ٹرپ لیڈر نے سورج کی روشنی کی بہت کم تعداد گھنے جنگل کی زمین تک پہنچنے کا بتایا۔

''عوشو جنگل'' سے دو راستے نکلتے ہیں جن میں سے ایک مغرب کی جانب دریائے گرل کو عبور کرتے ہوئے وادی کمراٹ اور دیر کی طرف جاتا ہے اور دوسرا شمال مشرق میں دریائے عوشو کے کنارے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر'' مہو ڈھنڈ'' جھیل کی طرف جاتا ہے۔ ٹرپ لیڈر نے چوہدری کمپس (فوجی اصطلاح جس کا مطلب مقامی لوگوں سے راستے کی رہنمائی کرنا ہے) کے استعمال سے یہ فیصلہ کیا کہ سڑک دگرگوں حالت کو دیکھتے ہوئے چھوٹا ''مہوڈھنڈ'' تک سیاحت کی جائے گی جو کہ آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ اس مقام پر دریائے عوشو کو کنٹرول کر کے ایک چھوٹی سی جھیل بنائی گئی ہے جہاں سیاح آ کر دریا اور ٹراؤٹ مچھلی سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ نیلگوں پانی اور خوبصورت نظارے دیکھ کر میں نے ایک بار پھر اِس خوبصورت دریا جو باقی لوگوں کے لیے ٹھنڈا اور تیز بھی تھا میں ڈائیو لگا دی اور خوب تیراکی کی۔

تھوڑی دیر بعد ایک بار پھر یہ احساس ہوا کہ اِس دفعہ بھی تیراکی کرنے والا میں اکیلا ہی تھا باقی سب تو صرف پاؤں ہی ٹھنڈے کر رہے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ٹرپ لیڈر بھی میرے ساتھ شامل ہو جائیں لیکن انہوں نے ٹراؤٹ مچھلی پکڑنے کی مہارت کا ثبوت دیا۔ جال اور فشنگ راڈ کی مدد سے 4 عدد ٹراؤٹ فش پکڑیں اور

نہایت لذیذ طریقے سے گرل کروائیں۔ بچوں نے کشتی رانی اور نشانے بازی سے لطف اندوز ہوئے۔ میں نے گرل فش اور گرم نان کی تصویر بنائی اور اپنے دوست میجر حنیف ملک کو جلانے کے لیے بھیج دی کیونکہ انہوں نے آخری موقع پر ٹرپ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ راستے میں ایک دفعہ پھر مذکر بھٹوں کا انتظار کرتے ہوئے قریبی مسجد میں عصر کی نماز ادا کی۔

یو اے ای کی تختی پڑھ کر سمجھ نہ آیا کہ ان ریاستوں کو اسلام سے کتنی محبت ہے اور اس کا اظہار وہ وطن عزیز ہی میں کیوں کرتے ہیں۔ گاؤں کے قبرستان میں دیکھا کہ قبروں کو لکڑیوں کے کریٹ میں الگ الگ بند کر دیا گیا تھا۔ واپسی پر کالام شہر کا کھلا پن اور کار پارکنگ کی آسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے خواتین کو شاپنگ کا موقع دیا گیا جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور بھابھی صاحبہ کی پشتو کی وجہ سے کوالٹی کے علاوہ قیمتیں بھی مُناسب کروانے میں مدد مل گئی۔ ویسے تو کار میں پٹرول بھروانے کا ذکر نہ کرتا لیکن تین وجوہات کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہے تم ایک تو یہ کہ آنے والے سیاحوں کو یہ پتہ چل سکے کہ کالام تک 38 لیٹر پٹرول استعمال ہوتا ہے۔ دوسری اطلاع بھی آنے والے سیاحوں کے لیے اہم ہے جو کہ پٹرول ڈالنے والے کارندے نے بتائی کہ یہ شہر کا واحد پٹرول پمپ ہے کہ جب سیاحوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو پٹرول کی قیمت ایک ہزار فی لیٹر تک بڑھ جاتی ہے اور جاننے والے یہ جانتے ہیں کہ اس قیمت کے لیے سوا چھے کام کرنا پڑیں گے اور جن کو نہیں پتہ وہ کرنل بختیار سے پُوچھ سکتے ہیں۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ کرنل بختیار صاحب نے سفرنامہ لکھنے کے آئیڈیے پر تعریف کرتے ہوئے حکم دیا تھا کہ" پھر ہم نے پٹرول ڈلوایا" جیسی فضول باتیں تحریر نہ کروں کیونکہ اُن کے رسالے میں فالتو جگہ لے گا۔ اب قارئین پٹرول سے متعلق معلومات کی سماجی، اقتصادی، منصوبہ ساز علمی اور حیران کُن اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

عصر کے وقت ہم" گاہل" روڈ پر پہنچ چکے تھے اور گیسٹ روم سے چند سو گز کے فاصلے پر احمد آصف نے سیب کے درختوں سے سیب اکٹھے کیے اور ماہ نور یاسر نے چھوٹے چھوٹے بچے اکٹھے کیے اور ان سے گپ شپ لگائی۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد پہاڑی نالے کی طرف سیر کے لیے روانہ ہوئے۔ دریائے سوات کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر وسٹن چرچل کی طرح میری بیگم نے بھی کہا کہ اس پاک دھرتی پے اللہ پاک کا کتنا احسانِ عظیم ہے اور ہم کتنے وسائل ضائع کر رہے ہیں۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ صرف" گاہل" نالے پر بنائی گئی ٹربائن سے پوری وادی کالام کو بجلی ملتی ہے تو بہت خوشی بھی ہوئی اور دریا کا پانی ضیاع ہونے کا دُکھ بھی۔

اللہ پاک میری ارض پاک کو مخلص لیڈر عطا کرے (آمین)۔ رات کو ٹرپ لیڈر کے ساتھ واپسی کے سفر کی منصوبہ بندی کی۔ صبح

سب خواتین نئے کپڑے پہن کر اور میک اپ کر کے کار میں ہی سوگئیں میں اور ٹرپ لیڈر ڈرائیو کرتے رہے۔ واپسی پر یہ احساس ہوا کہ سڑک بہت اچھی ہے۔ پہاڑی نالوں کو پار کرنے کے لیے 6 یا 7 پُل زیرِ تعمیر ہیں جو کہ اُمید ہے کہ بہت جلد مکمل ہو جائیں گے۔ سوات میں بہت زیادہ تعداد نان کسٹم پیڈ اور اَن رجسٹرڈ گاڑیوں کی ہے۔ یہ تمام گاڑیاں نہایت سستی ہیں لیکن صرف سوات میں ہی استعمال ہو سکتی ہیں۔ اَن رجسٹرڈ گاڑیوں کی سہولت تو 1949 میں سوات کی پاکستان کے الحاق کے وقت دی گئی کیونکہ یہاں پر پہاڑوں اور دریاؤں کی وجہ سے نہ ہی قابل کاشت زمین ہے اور نہ ہی انڈسٹری ہے۔ واپسی پر مینگورہ شہر کراس کرنے کے بعد جب ٹریفک کم ہوگئی تو بریکوٹ کے مقام پر چائے پی گئی۔ ''چکدرہ'' کے قریب سڑک کے کنارے پیپل کے درخت دلکش مناظر پیش کر رہے تھے۔ واپسی پر اباسین تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگا اور اباسین کا پُل کراس کرتے ہوئے یہ خیال آیا کہ نیلے پانی اب بہت دور رہ گئے ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد ''غازی بھروتھہ'' نہر کے نیلگوں سبز رنگ کے پانی کو دیکھ کر ایک دفعہ پھر تازگی کا احساس ہوا۔ اپنے سفر کی خوشگواری کا احساس آخر تک شامل حال رکھتے ہوئے گلبرگ گرین اور نیول انکریج سے ہوتے ہوئے لاہور میں داخل ہوئے تو اُس وقت عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ چونکہ راستے میں دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے شام کا کھانا باہر سے کھایا گیا اور کمال مہارت سے میری بیگم صاحبہ نے وہ بل بھی سفری خرچے میں شامل کر دیا۔ اُسی دن 11 ستمبر کو ماہ نور یاسر نے تمام ویڈیوز اور تصاویر کی مدد سے ایک کولاج بنایا اور اس میں دو گانوں (واسوات گلونہ داہ پخیر راغلے) اور (پہاڑوں کی قسم) کا میوزک شامل کر کے بہت خوبصورت ویڈیو تیار کی۔ جس کو دیکھ کر پتا نہیں لوگوں نے کیا کیا لیکن خبر ملی کہ اگلے روز میرے دوست میجر حنیف ملک جو کسی مصروفیت کی وجہ سے ہمارے ساتھ ٹرپ پر نا جا سکے وہ فیملی کو لے کر مری چلے گئے (وجہ کا اندازہ آپ کر ہی سکتے ہیں)۔ مجھے اُمید ہے کہ میری بیگم آمنہ یاسر اپنی مصوری اور شاعرانہ مہارت کو کام میں لاتے ہوئے اِس ٹرپ کے حوالے سے کچھ مصوری اور شاعری ضرور کریں گی۔ میں ابھی اور بھی لکھنا چاہتا تھا کیونکہ لکھتے ہوئے مجھے میرے والد مرحوم بہت یاد آ رہے ہیں اور وہ ہوتے تو میری اس کاوش کی تصحیح کر کے اس کو اپنی شاعرانہ مہارت سے مزید دلکش بنا دیتے لیکن اگر اور زیادہ لکھا تو کرنل بختیار سے کون 1985 کے سوات کے سفرنامے کے بعد آج پہلی دفعہ اُردو میں اپنی مرضی سے تحریر لکھی ہے۔

میں میجر عبداللہ اور اُن کی ٹیم کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے ہمارے لیے اعلیٰ انتظام و انصرام کا بندوبست کیا۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

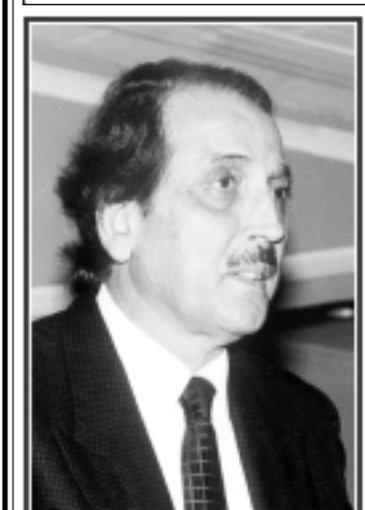

شوکت علی شاہ

ہنس کر بولی "سمندر بڑے ظالم ہوتے ہیں، ان میں خورشید ڈوبتے ہیں، اُبھرتے ہیں" وہ اُداس ہوگئی۔

"ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔" میں نے اس کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کہا "تم ماڈل ہو۔ بہت خوبصورت ہو۔ تمہارے تو آگے پیچھے فوٹو گرافروں کی فوج ہونی چاہیے تھی اور اگر سچ پوچھو تو تمہیں ہالی کے بجائے ہالی وڈ میں ہونا چاہئے تھا۔"

بولی "تعریف کا شکریہ۔ I am swelled لیکن حقیقت یہ ہے کہ I am a model in the making میں نے تھوڑا عرصہ پہلے کام شروع کیا ہے۔ باقی

رہی ہالی وڈ کی بات تو انہیں شکل سے زیادہ اچھی ایکٹنگ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔''

جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے آسٹریلیا پر کتاب لکھی ہے تو بولی ''مجھے ایک کاپی دو۔ میں فارغ وقت میں پڑھوں گی۔''

''کتاب اُردو میں لکھی ہے تم پڑھ نہیں پاؤ گی۔'' کہنے لگی ''انگریزی میں کیوں نہیں لکھی۔''

''اگلی انگریزی میں ہوگی۔'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''بہت مختصر ہوگی ہماری ملاقات کی طرح''

ہوٹل پہنچ کر ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ جب میں تیار ہو کر ناشتہ کرنے ریسٹورنٹ میں آیا تو کونے کے ایک ٹیبل پر ٹریسی ناشتہ کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں نے اپنی پلیٹ میں پنیر اور تازہ فروٹ ڈالا اور اس کے ساتھ ناشتہ کرنے لگا۔

کہنے لگی ''ویسے تو دنیا کے سب ہوٹلوں میں اچھا ناشتہ ملتا ہے لیکن بالی نے اس میں بھی بہت جدت پیدا کی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اچھے کھانے پکانے سے خدا خوش ہوتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر ایٹم چکھنے کو جی کرتا ہے۔ جہاں چالیس پچاس آئٹم ہوں، وہاں چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر جاتا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ انسانی نفسیات ہے کہ ایسے موقع پر اکثر لوگ Eat with a sense of Vengeance آدمی چھٹی پر ہو، ہوٹل کا پورا کرایہ دیا ہو، تو پھر مفت کے کھانوں کے ساتھ بھی پورا انصاف کرنا پڑتا ہے۔''

ابھی ہم ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ مائیک پر اعلان ہوا کہ ٹورسٹ بس پہنچ گئی ہے۔ جنہوں نے بالی کی سیر کرنی ہو وہ بس میں بیٹھ جائیں۔ سیاحوں نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اُٹھ کر بس کی طرف چلے گئے۔ فرنٹ سیٹ خالی تھی ہم دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ فرنٹ سیٹ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شہر کو بہتر طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ دائیں بائیں گردن نہیں گھمانا پڑتی۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ تنگ سڑکیں، ٹریفک کا رش، بازار میں بیشتر دکانیں ہندوؤں کی تھیں۔ سارا شہر ایک گھنٹے میں دیکھ لیا۔ بس شہر سے باہر نکلی تو کوچ کیپٹن نے اعلان کیا کہ اب ہم بالی کے مندر، چاندی کے کارخانے اور پرانے ہندو مکانات دیکھنے جائیں گے۔ کوچ کیپٹن کس قدر بارعب نام ہے۔ انگریزوں نے گاڑی چلانے والوں کو ڈرائیور کہہ کر اس کی تضحیک کی تھی۔ امریکن پیشے کی عظمت کے قائل ہیں اس لیے کام تو وہی لیا لیکن نام کی حد تک Exalt کر دیا۔ مالی کو Lawn doctor کہتے ہیں۔ نائی کو Hair manager۔ بیت الخلا کو واش روم لکھا جانے لگا۔ وہی لوگ جو ٹائلٹ کا پتہ پوچھتے ہوئے بدکتے تھے اب بلا جھجک کہتے ہیں۔ واش روم کدھر ہے۔ انگریزی زبان نے اس حد تک ہماری خاصی مدد کی ہے۔ کسی عظیم ادیب نے لکھا تھا کہ یہ کہتے ہو کہ

میری حیثیت نہیں ہے یا پنجابی والی ''پیچ'' نہیں ہے، آدمی احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے لیکن جب یہ کہتا ہے I can not afford it تو مالی حیثیت کو بھول کر وہ اپنی انگریزی دانی پر فخر کرنے لگتا ہے۔

چاندی کا کارخانہ دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی۔ دنیا میں سونا چاندی تو ہر ملک میں موجود ہیں لیکن اس قسم کی صناکاری کہیں نہیں ہوتی۔ برسہا برس کی محنت اور مہارت نے انہیں منفرد بنا دیا ہے۔ سیاحوں کا ایک جم غفیر تھا جو سوونیئر خرید رہا تھا۔ بالی کی یادیں تو روح کو گدگداتی ہیں لیکن یہ تحفے بھی ڈرائنگ روم کی زینت بنتے ہیں اور جب لوگ انہیں تحسین بھری نظروں سے دیکھتے ہیں تو ایک عجیب قسم کے تفاخر کا احساس ہوتا ہے۔

When I was in Bali جب میں سوئٹزرلینڈ میں وی وی جھیل میں بوٹنگ کر رہا تھا۔ ان الفاظ کے صوتی اثرات روح کو گدگداتے ہیں اور جسم میں پھلجھڑیاں سی پھوٹتی ہیں۔ شو روم میں چاندی کے منقش ظروف، ٹی سیٹ، کشتیاں، مختلف جانور، میکسس، زیورات، تاریخی عمارات کے Replicas سجائے گئے تھے۔ عمارات جن میں تاج محل، اہرام مصر، مجسمہ آزادی، ایفل ٹاور قابل دید تھے۔ قیمت سو ڈالر سے لے کر دس ہزار ڈالر تک۔ ٹریسی نے چاندی سے بنا ہوا تاج محل خریدا۔ خاصا مہنگا تھا۔ مجھے حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی۔ بے اختیار شاہجہان کی عظمت کو سلام کرنے کو جی چاہا۔ دشمن شاہ جہاں ساحر لدھیانوی نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھ لیا لیکن اس عظیم جذبے کو نہ پہچان سکا جو اس کی تعمیر کا باعث بنا۔ ہندوستان میں سینکڑوں مسلمان حکمران گزرے لیکن آج دنیا میں انھیں کوئی جانتا تک نہیں۔ صرف شاہ جہان زندہ ہے۔ تاریخ میں بہت کم لوگ گزرے ہیں جو مر کر بھی زندہ رہنے کا فن جانتے ہیں۔ تاج محل مردہ شاہوں کا مقبرہ نہیں ہے۔ اس محبت کا مظہر ہے جس کے بغیر یہ کائنات ادھوری ہے کاروان زندگی چل نہیں سکتا، شجر زیست میں ہریالی نہیں آتی۔

''کیا تم نے تاج محل دیکھا ہے جو اس قدر چاہت سے خرید لیا ہے؟''

بولی ''صرف تاج دیکھنے ہندوستان گئی تھی دنیا میں اس قدر خوبصورت عمارت کہیں نہیں ہے۔''

''تاج محل کے پاس کھڑی ہوئی بالکل ممتاز محل لگ رہی ہو۔'' میں نے اسے چھیڑا

کہنے لگی ''وہ یقیناً دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تھی۔ خوبصورت تو ہیلن آف ٹرائے، قلوپطرہ بھی تھیں۔ بالآخر بے نام و نمود پیوند خاک ہو گئیں۔ پتہ نہیں چلتا کہاں دفن ہیں۔ ان کے چاہنے والے تو ہزاروں تھے لیکن وہ محض جسم کے سوداگر تھے۔ ٹرائے کی جنگ یونان کی عزت اور وقار کے لئے نہیں لڑی گئی تھی۔ یونانی جنگجوؤں کی ہوس تھی جس کی وجہ سے سات سال تک

ہزاروں لوگ خاک اور خون میں غلطاں ہو گئے۔ وہ کبھی بھی جنگ میں شامل نہ ہوتے اگر ہیلن کا خاوند ان سے ایک وعدہ نہ کرتا That each one of them will get a share in abductees body یہی حال قلوپطرہ کا تھا۔ وہ پہلی عورت تھی جس نے حُسن کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ ممتاز ایک وفا شعار بیوی تھی۔ شاہجہان ایک Committed husband تھا۔ نہیں تو سترہ بچوں کی ماں کے لئے کون محل تعمیر کراتا ہے۔ ویسے تو شاہی حرم میں ہزاروں عورتیں تھیں لیکن ممتاز ایک ہی تھی۔ حُسن اور محبت کی ایسی لازوال داستان دنیا نے کبھی نہ سنی ہوگی۔''

''تم ماڈل کم اور فلاسفر زیادہ لگ رہی ہو۔ اس عمر میں خیالات میں اتنی پختگی کیسے پیدا ہوگئی ہے؟''

''کیونکہ میں تاریخ کی طالب علم ہوں۔ مجھے ان جذبوں کا بھی ادراک ہے جو اس قسم کے شہکاروں کا محرک بنتے ہیں۔''

''گویا تم نے بھی محبت کی ہے؟''

''اس دنیا میں کون ہے جو محبت نہیں کرتا۔ ہم لوگ اس لامحدود جذبے کو بہت محدود کر دیتے ہیں۔''

''وہ شخص یقیناً خوش قسمت ہوگا جس کے گلے کا تم ہار بنو گی۔''

کہنے لگی ''لگتا ہے تمہاری رگ ظرافت پھر سے پھڑک رہی ہے۔ گلے کا ہار بسا اوقات گلے کا پھندا بھی بن جاتا ہے۔''

میں نے بھی نشانی کے طور پر ایک کشتی خریدی جو متلاطم سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

کوچ چلی تو مائیک پر کپتان کی آواز اُبھری۔ کہنے لگا ''اب ہم آپ کو مندر اور قدیم مکانات دکھائیں گے۔ چونکہ مندر تک پہنچنے میں نصف گھنٹہ لگے گا اس لئے بالی کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں گے۔ پیشتر اس کے کہ میں اس کے خال و خد پر بات کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ بالی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ یہ حسینہ جنوب مشرقی ایشیا کی شہزادی ہے جس طرح ایک اچھی خوشبو عطار کے لب بیچ دیتی ہے اور اپنا پتہ خود بتاتی ہے اسی طرح بالی کی فضاؤں میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا ہے کہ Seeing is believing- یہ جزیرہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہاں وقتاً فوقتاً عرب آئے۔ ہندوستان سے ہندوؤں نے ہجرت کی۔ چینی بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں آ کر سب انڈونیشین بن گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا اور کوئی تشخص نہیں ہے۔ ان کے خال و خد نمایاں اور جاذب نظر ہیں۔ تانبے کی طرح دمکتا ہوا رنگ جس میں سونے کی جھلک ہے خوبصورت لمبے کالے چمکیلے بال، مناسب قد، بالی کا حسن صرف ساحلوں سمندر اور پہاڑوں تک محدود نہیں ہے۔ اس کے لوگ بھی اس کے حسن کے مظہر ہیں۔

اس کی حسینائیوں کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا ہے جیسے سیب، انناس اور پپیتے کا رس یکجا ہو گیا ہو۔

''بڑی زبردست تشبیہیں دے رہے ہو، شاعر تو نہیں ہو؟'' ایک برطانوی سیاح نے پوچھا۔
بولا ''میں صرف ڈرائیور نہیں گائیڈ بھی ہوں۔ ایک پیشہ ور گائیڈ کو بیک وقت مورخ، شاعر اور ماہر نفسیات بھی ہونا پڑتا ہے۔''
''ہمیں کچھ بیچز کے متعلق بتاؤ'' ٹریسی اس نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔
گائیڈ نے ہلکی سی گردن موڑ کر ٹریسی کو دیکھا اور پھر دوسری نگاہ بھی اسی پر ڈالتے ہوئے کہنے لگا ''بیچ Beach بھی دراصل ایک عورت کی طرح ہوتی ہے۔ حسین، مغرور، مخمور، نرم و گداز، لچکدار، جوان اور بدقماش۔ تم لب و لہجے سے آسٹریلین لگتی ہو۔ اگر تم نے ایل اے کی سانتا مانیکا، ہوائی کی وائی کیکی میامی نیس اور کانز کی بیچیں دیکھی ہوں تو تمہیں تقابلی جائزہ لیتے ہوئے لطف بھی آئے گا اور فرق بھی محسوس کر سکو گی۔
بولی ''اس کے لئے کہاں کہاں جانا ہوگا؟''
کہنے لگا ''ویسے تو ہر بیچ دیدنی ہے لیکن تمہارے پاس اگر وقت کم ہے تو تم Kuta beach, Nusa beach سانور سنور اور لیگین Legian جا سکتی ہو۔ اکثر سیاح نوسا جاتے ہیں کیونکہ سب فائیو سٹار ہوٹل اس کے کنارے پر ہیں۔ بالی کے جنوب میں سانور ہے جو شہر سے پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ اس طرح دیگر بیچز بھی زیادہ دور نہیں ہیں۔
''یہاں کے پہاڑ بھی خاصے مشہور ہیں؟''
میں نے پوچھا۔
''کیا تم انڈین ہو؟'' وہ اپنے تجربے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بولا۔
''پاکستانی، سو فیصد خالص'' میں مسکرایا۔
کہنے لگا ''ایک ہی بات ہے۔ ملک تقسیم ہو گیا ہے Race تو نہیں بدلی۔''
''ایک ہی بات نہیں ہے۔ رام داس جی! پاکستانی پاکستانی ہے اور ہندو، ہندو۔''
میرا جذبہ حب الوطنی عود کر آیا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات اُبھرے لیکن پروفیشنل تھا جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولا ''چلو، تمہارا استدلال مان لیتے ہیں۔ میں نے تو ضمناً بات کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک پاکستانی کو یہ بتاتے ہوئے کہ یہاں کا سب سے اُونچا پہاڑ Gunung Agung ہے جس کی اُونچائی 2567 میٹر ہے کوئی فخر و مباہات کی بات نہیں ہے۔ مجھے علم ہے کہ ناگا پربت، K2 اور راکاپوشی کس قدر اُونچی ہیں۔ 28 ہزار فٹ کے مقابلے میں 7 ہزار کی کیا حیثیت ہے۔ بدقسمتی سے پہاڑ پر بھی برف نہیں پڑتی۔ بالی کا موسم ہی کچھ ایسا ہے۔ اس کے علاوہ چند قابل ذکر پہاڑ Gunang batur, Gunang Cator, Gunang Abang, سب ان کی اُونچائی تو اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن دشوار گزار ہیں۔ اگر جانا ہو تو گائیڈ ضرور ساتھ رکھنا۔ زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑتا چالیس ڈالر میں گائیڈ مل جاتا ہے۔''

کوچ مندر کے قریب رک گئی۔ چھوٹا سا مندر تھا۔ عمارت کاشی اور متھرا کے مندروں کی طرح عظیم الشان تو نہ تھی لیکن پجاریوں کا انہماک اور خضوع وخشوع ایک جیسا تھا۔ پرارتھنا کے لیے سنگ مرمر کے پتھر ضروری نہیں ہیں۔ انہیں پوجا کرتے دیکھ کر حضرت نظام الدین اولیاء کے وہ لفظ یاد آ گئے۔ ہر کس برسم ورا ہے، دین وقبلہ گا ہے۔ مندر میں بے شمار مورتیاں رکھی تھیں۔ تازہ پکے ہوئے کھانے اور پھل بھی قریب رکھے تھے۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے ہندومت اور بالی کے ہندو ازم میں کافی فرق ہے۔ یہ ناچ کر، کھانے پکا کر اور آرٹ سے اپنے دیوتاؤں کو خوش کرتے ہیں۔ دنیا میں جس قدر دیو مالائیں ہیں ان میں ہندو مائتھالوجی سب سے زیادہ گنجلک، دلچسپ اور رومانی عنصر رکھتی ہے۔ مندر میں ناقوس، گھنٹیاں، لوبان اور اگربتیاں اس طرح کی تھیں جیسے ہندوستانی مندروں میں ہوتی ہیں۔

مندر سے ملحقہ پرانی آبادی تھی۔ کافی مکان اب کھنڈر بن چکے تھے۔ ہر مکان کے آگے ایک حفاظتی دیوار تھی۔ جو بدروحوں کو روکنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ دیوار کی وجہ سے وہ اندر نہ آ سکتی تھیں۔ دیوار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے آلے بنائے گئے تھے۔ ان میں سرشام ہی صاحب خانہ کھانا رکھ دیتا تھا۔ یہ ایک قسم کی رشوت تھی جو بدروحوں کو دی جاتی تھی۔ یہ بدروحیں کون تھیں؟ وہ لوگ جنہوں نے پہلے جنم میں کالے کرتوت کیے تھے۔ گناہ آلود زندگی گزاری تھی۔ ہندو آواگون کے قائل ہیں۔ مرکر آدمی پھر سے جنم لے سکتا ہے۔ روحوں کا تصور ہر مذہب میں ہے۔ آواگون یا تناسخ کے قائل صرف ہندو ہیں۔ اسلام میں ان کا تصور قدرے مختلف ہے۔ روز ازل وعدہ الست انہی سے لیا گیا تھا۔ الست بربکم؟ بلی۔ سب روحیں ایک ساتھ پکاری تھیں۔

جب ہم ہوٹل پہنچے تو دن کے تین بج رہے تھے۔ ٹریسی کہنے لگی ”اب تھوڑا سا آرام کیا جائے۔ شام کو بیچ پر چلیں گے۔ صبح تمہاری وجہ سے میں سوئمنگ نہیں کر سکی۔ رات کو گالا نائٹ ڈنر ہے۔ بالی کی مشہور رقاصائیں اپنے فن کا مظاہرہ کریں گی۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں نے کمرے میں آ کر لباس تبدیل کیا۔ کچھ زیادہ بھوک نہ تھی، روم سروس کو فون کر کے سینڈوچ منگوائے اور کھانا کھا کر سو گیا۔

شام کو ہم نے کیب پکڑی اور نوسا بیچ پہنچ گئے۔ ٹریسی نے سوئمنگ کاسٹیوم پہنا، ساحل پر بنے ہوئے باتھ روم میں شاور لیا اور سمندر میں کود گئی۔ میں نے جو اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو عجیب منظر دیکھا۔ ہزاروں کی تعداد میں جوان جسم، نیم برہنہ ریت پر لیٹے آرام فرما رہے تھے۔ اسی طرح بے شمار مرد اور عورتیں سمندر کی لہروں کے ساتھ اُبھر اور ڈوب رہے تھے۔

ریت پر لیٹی ہوئی عورتوں نے بکنیاں اُتاری ہوئی تھیں۔ بے شمار مرد بھی اِدھر اُدھر پھر رہے تھے لیکن کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔

مجھے وہ دیہاتی یاد آ گیا جس نے پہلی مرتبہ شہر آ کر لاٹھی گھما کر حلوائی کی بصارت ٹمیٹ کی تھی۔ میں صرف چند منٹ کھڑا رہ سکا۔ بیچ پر کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جس نے سوئمنگ کاسٹیوم نہ پہنا ہو۔ سب نہانے کے لئے آئے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں جانے کی کوئی تک نہ تھی۔ ساحل سے چند فرلانگ کے فاصلے پر چٹان تھی۔ وہاں پانی بہت گہرا تھا اس لئے نہانے کی ممانعت تھی۔ لائف گارڈز نے خطرے کے بورڈ لگا رکھے تھے۔ میں چلتا ہوا چٹان کے قریب پہنچا تو ایک شخص ''چھلیاں'' بھون رہا تھا۔ میں نے ایک چھلی خریدی اور چٹان پر بیٹھ کر من موجی سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔ یہ ہزاروں حسیناؤں کے لمس کا اثر تھا یا ویسے ہی سمندر ترنگ میں آیا ہوا تھا، اس کی لہریں بڑے جوش سے اُبھرتی ہوئی آتیں، چٹان سے سر پٹختیں اور سفید جھاگ چھوڑ کر واپس چلی جاتیں۔ ان مسلسل حملوں کے باوصف چٹان کی استقامت میں بظاہر کوئی فرق نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے علم تھا کہ ان کی جدوجہد کسی نہ کسی دن رنگ لائے گی اور چٹان اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکے گی۔ سکول میں منشی لالہ ہمیں اسی چیز کا درس دیتا تھا۔

جو پتھر پہ پانی پڑے مستقل
تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
رہو گے اگر تم بھی یوں مستقل
تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل

شام کو ہوٹل کی گالا نائٹ تھی۔ وسیع سرسبز لان کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور غباروں سے سجایا گیا تھا۔ لان کے آخری کونے پر سٹیج بنی تھی۔ ہوٹل ہر ویک اینڈ پر اس کا انتظام کرتا تھا۔ بالی کی مشہور رقاصاؤں نے پرفارم کرنا تھا۔ اس قسم کے فنکشن بالی کے کلچر کو سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

رات نو بجے فنکشن شروع ہوا۔ رقاصاؤں نے بہترین ناچ کا مظاہرہ کیا۔ یہ نہ تو وہ مغربی ڈانس تھا اور نہ ہندوستان کا کلاسیکی رقص۔ ہر رقص ہندو مائیتھالوجی کے کسی نہ کسی Aspect کو اُجاگر کرتا تھا۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے جسم حرکت میں آ رہے تھے۔ ہنومان جی کو خوش کرنے کے لئے ''منکی ڈانس'' کیا گیا۔ وشنو، گنیش مہاراج اور کالی ماتا کے حضور بھی ہدیہ عقیدت پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ بازی گروں، جادوگروں نے بھی اپنے کرتب دکھائے۔ جادو کے کرتب ہوتے تو نظر کا فریب ہیں لیکن وقتی طور پر حاضرین کو Spell bound کر دیتے ہیں۔ ہیٹ سے کبوتر تو ہمارے بازی گر بھی نکالتے رہتے ہیں، ہیٹ سے ہرن بالی کے بازی گر ہی نکال سکتے ہیں۔ ایک دو کامیڈین بھی تھے، جنھوں نے ہنسا ہنسا کر لوگوں کو لوٹ پوٹ کر دیا۔ آخری آئیٹم صلاء عام ہے یاران نکتہ دان کے لئے تھا Couple dance-c سب جوڑے سٹیج پر آ گئے۔

ٹریسی کہنے لگی ''Let us dance''

میں نے معذرت کر لی ''مجھے ناچنا نہیں آتا'' مجھے واقعی ناچنا نہیں آتا تھا۔ بچپن میں ہم کسی تقریب

میں بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ غلاموں میراثی نے مجھے کہا ''تمہارے قدم نہیں مل رہے۔ تم ناچ نہیں محض اُچھل رہے ہو۔'' میں نے ناچنا بند کر دیا۔

اس بدبخت نے ایک جملہ کہہ کر ساری زندگی کے لیے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ جب بھی کسی تقریب میں ناچنے کو جی چاہا دو خنزیر نظروں کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ ''تمہارے قدم نہیں مل رہے۔'' بعض اوقات ایک جملہ بھی زندگی کو کس قدر متاثر کر جاتا ہے۔

فنکشن رات کو دو بجے ختم ہوا۔ صبح مجھے پہلی فلائٹ پر جکارتہ جانا تھا۔ ٹریسی سے ہاتھ ملا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ ''خوش گوار سفر کا مفہوم صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھیں تمھاری رفاقت میسر ہوتی ہے۔''

انکساری کے لہجے میں بولی ''It was on the basis of Reciprocity

ایک سفرنامہ نگار کے ساتھ دن گزارنا مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ بہت چھوٹی دنیا ہے کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو ملاقات ہوگی۔''

میں اُسے کیا بتاتا۔ دنیا تو چھوٹی ہوگئی ہے لیکن انسان بھی گھٹ گئے ہیں۔ چار سو جو ہم اژدہام دیکھتے ہیں یہ محض سائے ہیں۔ انسان اس قدر مصروف یا مجبور ہوگیا ہے کہ اپنے آپ سے بھی نہیں مل پاتا اپنے اندر تک نہیں جھانک سکتا اپنی خبر گیری نہیں کر پاتا۔

جکارتا: جکارتا ایئرپورٹ بڑی حد تک دیگر ایئرپورٹس سے مختلف ہے۔ تمام گیٹ دائروں میں بنے ہوئے ہیں۔ دائروں کی ساخت میں اسلامی طرز تعمیر اپنایا گیا ہے۔ پتہ نہیں اس کا آرکیٹیکٹ کون تھا لیکن کریڈٹ حکومت کو جاتا ہے۔ انڈونیشیا جو دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ کسی زمانے میں پاکستان اس کی ہم عصری کا دعویٰ کرتا تھا لیکن جب سے مشرقی حصہ الگ ہوا ہے یہ سعادت صرف انڈونیشیا کو نصیب ہوئی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ سارے جنوب مشرقی ایشیا میں صرف دو ملک ایسے ہیں جنھوں نے من حیث القوم اسلام کو قبول کیا۔ ملائشیا اور انڈونیشیا، کوریا، ویت نام، چین، جاپان، فلپائن، برما اور تھائی لینڈ بدھ مت اور دیگر مذاہب کے زیر اثر رہے۔ ان ملکوں میں بھی مسلمان بستے ہیں لیکن ان کی اکثریت نہیں ہے۔ جب آدمی جغرافیے کی کتاب میں پڑھتا ہے کہ انڈونیشیا لاکھ جزیروں پر مشتمل ایک ملک ہے تو لاشعوری طور پر سوچتا ہے کہ کہیں کتابت کی غلطی تو نہیں رہ گئی۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس ملک میں بالی جیسے بڑے جزیرے بھی ہیں اور ایسے بھی جو چند ایکڑوں پر محیط ہیں۔ ملک بے ہنگم طور پر پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ Archiplego ہے۔ اس کا ایک سرا آسٹریلیا سے جا ملتا ہے تو دوسرا ملائشیا کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہوا نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی واضح اکثریت کے باوصف مذہبی رواداری ہے۔ کہیں بھی کافر کافر کے نعرے نہیں لگتے۔ مولوی وہاں بھی ہیں لیکن کسی نے سوئکارنو کو کافر اعظم نہ کہا۔ اسے مرے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں لیکن آج بھی اس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ بنگ کارنو (بھائی کارنو)

زندہ قومیں اپنے محسنوں کو نہیں بھولتیں۔ یہ درست ہے کہ سوکارنو کے بعد جو فوجی لیڈر شپ آئی وہ بھی مال وزر کی ہوس کا شکار ہوگئی لیکن سوہارتو کے طویل دور اقتدار نے اس کی معیشت کو مضبوط کیا سیاسی استحکام بخشا۔ ایک وقت تھا جب سمجھ نہیں آتی تھی کہ انڈونیشی روپیہ مضبوط ہے یا وہ کاغذ قیمتی ہے جس پر نوٹ چھاپا گیا ہے۔ سڑکیں گڑھوں میں بدلی گئی تھیں اب کافی حد تک معیشت سنبھل چکی ہے۔

جکارتا جنوب مشرقی ایشیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ چوتھی صدی میں آباد ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک اس نے کئی نام بدلے۔ ۳۹۷ سے لے کر ۱۵۲۷ تک یہ سنڈا کیلاپا Sunda Kelapa کہلاتا تھا۔ پھر جیا کرتا Jaya Karta کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس نام میں بھی اسے کوئی خامی نظر آئی تو ۱۹۴۳ میں جکارتا رکھ لیا۔ یہ متلون مزاج شہر ابھی تک اسی نام کو اپنائے ہوئے ہے۔ جاوا کے شمالی ساحل پر واقع ہے۔ سیمابیت صرف اس کے حصے میں نہیں آئی بلکہ دیگر شہر بھی اسی روش کا اظہار کر چکے ہیں۔ بنکاک نام کسی زمانے میں رتنا کوسین ہوا کرتا تھا۔ شہر تو شہر لوگوں کو بھی Assumed names کا شوق ہے۔ ہوچی منہ کا اصل نام کچھ اور تھا۔ لیڈر بنتے ہی یہ نام رکھ لیا جس کے معنی ہیں He who enlightens (وہ جو روشنی بخشتا ہے۔ اسی طرح ویت نام کی فوجوں کے کمانڈر جنرل Giap نے بھی یہ نام مستعار لیا تھا جس کے معنی Armour کے ہیں۔

ڈچ بارہ مصالحوں کی اس سرزمین پر مرمٹے تھے۔ دور دراز سے آئے ہوئے ایک نہایت ہی چھوٹے ملک کی فوج اس عظیم الشان ملک پر کیسے قابض ہوگئی۔ یہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔ ہندوستان ہو، سنگاپور ہو یا انڈونیشیا، ان کی شکست کا سبب تعلیم کی قوت نہ تھی بلکہ گھر کو گھر کے چراغ ہی جلاتے رہے۔ یہ ملک راجواڑوں اور سرداروں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر ایک دوسرے کا حریف تھا اور خائف بھی۔ چنانچہ جب بھی باہر سے حملہ آور آئے تو انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف ان کی مدد کی۔ انھیں اپنی حماقت کا احساس اس وقت ہوتا جب ان کا بھی ٹیٹوا دبا دیا جاتا۔ جب جاپانیوں نے جاوا پر قبضہ کیا تو ڈچ حکومت ختم ہوگئی لیکن جیسے ہی جاپان کو شکست ہوئی تو وہ برطانوی مدد سے واپس آ گئے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۴۵ کو برطانیہ نے حملہ کر کے ہزاروں انڈونیشی مار ڈالے۔ اس پر ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی اور ۱۹۴۶ کو ولندیزیوں نے ریپبلک کو تسلیم کر لیا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ کو ملک مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔ سوکارنو نے سولہ سال تک حکومت کی۔ ۱۹۶۵ میں انقلاب کے بعد فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔ ایک طویل عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد سوہارتو نے اقتدار چھوڑ دیا۔

[جاری ہے۔]

غزل

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا

ہر گلی ، ماہ رُخی ، مہر سنی کے چرچے
کوئی سنتا ہی نہیں در بدروں کا رونا

کچھ بجھائی نہیں دیتا پسِ دیوارِ بکا
کون سنتا ہے ترے خیرہ سروں کا رونا

ہر قدم نیم تنوں ، نیم سروں کا ماتم
ہر نفس سیم تنوں ، سیم بروں کا رونا

لب کشا ہو کے ، کسے کم سخنی یاد رہی
کون رویا ہے اڑانوں میں پروں کا رونا

ہر طرف جورِ حشم ، جاہِ ستم کے شکوے
کوئی روتا نہیں بے ذہن سروں کا رونا

اے فلک، کب ترے چہرے پہ شفق پھولے گی
رنگ کب لائے گا بجھتی سحروں کا رونا

ہم نے ہر رات نئی صبح کا رستہ دیکھا
عمر بھر روئے فقط راہ گروں کا رونا

ہر قدم گوش برآواز پھرے ہیں خالد
ہم نے جی بھر کے سنا، پختہ گھروں کا رونا

خالد احمد

غزل

اب کے بندگی عالی کیسی امتحانی ہے
غم غزہ کا رونا ہے عید بھی منانی ہے

مرگ منظری ایسی چھا رہی ہے سارے میں
ڈھیر بیچ بچپن ہے آگ میں جوانی ہے

واں بموں کی یلغاریں چیتھڑے اڑاتی ہیں
یاں تمام ہمدردی صرف منہ زبانی ہے

ہم جو روگ جیتے ہیں ہم جو سوگ پیتے ہیں
اِس تمام کے پیچھے اور ہی کہانی ہے

ناتوانیِ جاں پر کیا ہے یہ لہو اندر
قطرۂ لبِ جُو ہیں خبطِ بےکرانی ہے

دعویِٰ فقیری کیا کس کو اس کا اندازہ
کون سی طلب کس پل دل میں آ سمانی ہے

حلقۂ معانی میں کچھ بھی تو نہیں بدلا
لفظ ہیں نئے لیکن گفتگو پرانی ہے

جلیل عالی

غزل

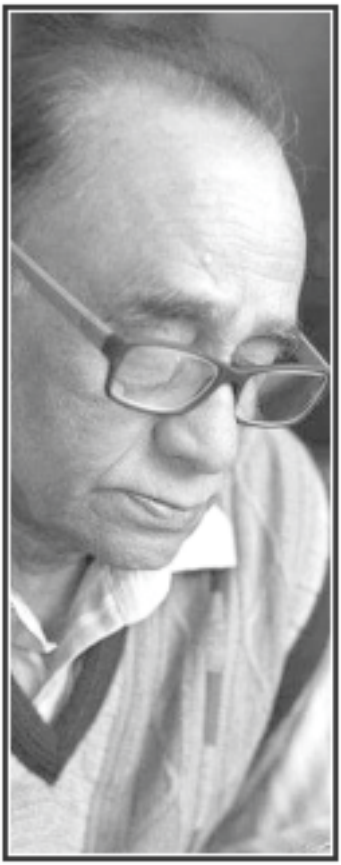

وہ عالمِ خیال میں دل کے مکین ہیں
لیکن کوئی گمان نہیں ہیں ، یقین ہیں

اچھی گزر رہی ہے کسی دُھن میں زندگی
لیل و نہار و شام و سحر بہترین ہیں

اُن میں کسی لحاظ سے کوئی کمی نہیں
اتنے ہی سنگدل ہیں وہ جتنے حسین ہیں

ایک آپ اور ایک رقیب اور ایک ہم
کردار داستانِ محبت میں تین ہیں

مذہب بھی کیا بہانۂ جنگ و جدل نہیں
جیسے بہانے تفرقہ زر ، زن ، زمین ہیں

ہم شاعری سُنانے کہاں جائیں اے شعور
اب وہ مشاعرے ہیں نہ وہ سامعین ہیں

انور شعور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہل زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہر جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

غزل

اس لئے بھی منفرد لگتا ہوں سب میں ایک مَیں
گامزن ہوں آج بھی دشتِ طلب میں ایک مَیں!

بے اثر اہلِ خرد پر دشت و صحرا کی صدا
رہ نہ پایا حلقۂ خشت و خشب میں ایک مَیں

بزمِ یاراں میں ہدف بھی مَیں رہا تنقید کا
اور تھا خاموش بھی پاسِ ادب میں ایک مَیں

مختلف تھا، اس لئے مُجرم بھی گردانا گیا
طالبانِ شہرت و نام و نسب میں ایک مَیں

اور سب تو اس میں آسانی سے ضم بھی ہو گئے
اجنبی لگتا ہوں اس شہرِ عجب میں ایک مَیں

اس لئے میری صدا محسوس کی جانے لگی
چپ رہا تھا شہر کے شور و شغب میں ایک میں

صرف مَیں ہی جس کے ہر دُکھ درد میں شامل رہا
اُس کے ہاں مدعو نہ تھا جشنِ طرب میں ایک مَیں!

کوئی جگنو ڈھونڈنے، کوئی ستارہ دیکھنے
کون سرگرداں ہے اس تاریک شب میں، ایک مَیں!

کون ہے میرے مقابل بھی بھلا میرے سوا؟
کون دُشمن ہے مرا میرے عقب میں، ایک مَیں!

سر چھپا کر ریت میں سب نے بچاؤ کر لیا
گھر گیا وحشی بگولوں کے غضب میں ایک مَیں

ہر نفس مَیں پی رہا ہوں زہر، جینے کے لئے
کر رہا ہوں زندگی اپنے ہی ڈھب میں ایک مَیں

اور سب کب کے یہاں سے جا چکے، موجود ہوں
ہجر کے ویران کوئے منتخب میں ایک مَیں!

سب نے سطحی طور پر دیکھا ہے جلوہ یار کا
جھانک پایا ہوں رُخِ جاناں کی چھب میں ایک مَیں!

جانتا ہے کون اس مصروف بستی میں نسیم
کیوں گھرا رہتا ہوں رنجِ بے سبب میں ایک مَیں!

نسیم سحر

غزل

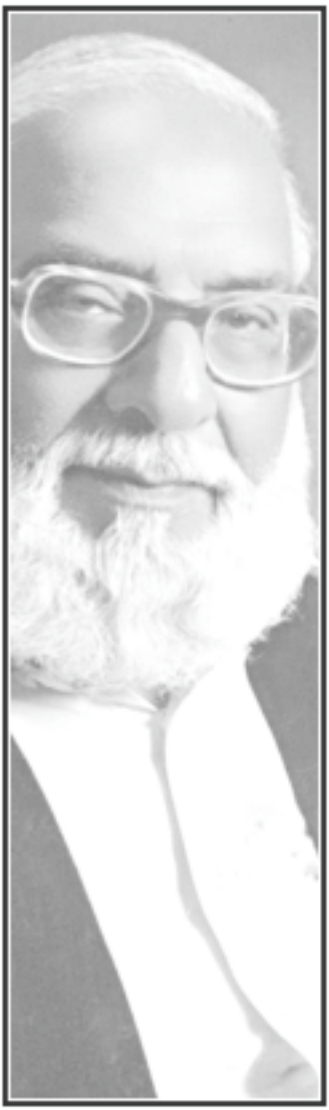

خواب کی تعبیر کوئی بھی تو حسب حال ہو
یوں درخشاں کوئی میرا عہد ماہ و سال ہو

ہر قدم پر فاصلوں کی دوریاں بڑھتی گئیں
خودسری سے کیا علاج درد اضمحلال ہو

خاکساری منزل مقصود تک لے جائے گی
ہاں مگر اک شرط ہے ، پہلے انا پامال ہو

جی میں آتا ہے خوش وخرم رہیں، پر کیا کریں
جوئے خوں آنکھوں سے بہہ جائے جو استحصال ہو

ہاتھ آ جائے ہنر بے مدعائی کا اگر
جو نظر آتا ہے بداحوال ، خوش احوال ہو

ارفع و اعلیٰ محبت کی یہی پہچان ہے
دو دلوں کے درمیاں کوئی نہ قیل و قال ہو

ہو مجید امجد کا اسلوب سخن اپنا شعار
ہر گلی کوچے میں اونچا نام ساہیوال ہو

گل فشاں ہو جائے گی ان کی پذیرائی میں جاں
وہ ریاض دل میں آئیں،ان کا استقبال ہو

سید ریاض حسین زیدی

غزلیں

کیوں نہ آئیں مجھے سارے بتِ عیّار پسند
روزِ اوّل سے بنایا مجھے دیدار پسند
ڈھلتے جاتے ہیں رُخِ یار سے خورشیدِ نگہ
اُٹھتے جاتے ہیں یہاں سے لب و رخسار پسند
ایک دن بیٹھ گیا آ کے مِرے رستے میں
وقت کو آتی نہیں تھی مِری رفتار پسند
میری لب بستگی نے رکھا ہے پردہ میرا
خوار ہوتے ہُوئے دیکھے گئے گفتار پسند
چین سے رہنے کی جا تھا ہی نہیں باغِ حیات
مَیں نے صیادِ اجل کو کِیا ناچار پسند
کبھی آ پڑتی ہے پاؤں کی بھی مٹی سر پر
کبھی درباں کو بھی آ جاتا ہے دربار پسند
عظمتِ رفتہ کا اِک مَیں ہی تھا شیدا خاورؔ
اور اَب کوئی نہیں منبر و مینار پسند

خاور اعجاز

دل الوہی جہان ہے شاید
یہ زمیں آسمان ہے شاید

گفتگو منکر و نکیر کے ساتھ
آخری امتحان ہے شاید

کوئی موجود ہے یہاں پر بھی
لامکاں بھی مکان ہے شاید

تیری باتیں ہی کرتا رہتا ہے
دل ترا ترجمان ہے شاید

اُس طرف کیا ہے، کچھ نہیں کھلتا
زندگی درمیان ہے شاید

غزل

جنگل کے اصولوں کی اطاعت نہیں کرتے
بھوکے ہوں درندے تو رعایت نہیں کرتے

ہم وہ خس و خاشاکِ رہِ کوئے بتاں ہیں
بت جن پہ کبھی چشمِ عنایت نہیں کرتے

پھر کیا ہے ملاقات و مُدارات کا مقصد
گر مجھ سے مری جان محبت نہیں کرتے

ہاتھوں پہ یزیدوں کے بزرگوں نے کہا تھا
سر کٹ بھی اگر جائے تو بیعت نہیں کرتے

پھر سوچ لو اک بار کہ تم کس کی طرف ہو
اپنے کبھی دشمن کی وکالت نہیں کرتے

اندھوں کی گواہی نہیں کرتا کوئی تسلیم
گونگے کبھی توہینِ عدالت نہیں کرتے

سچ پوچھو تو تاریکی میں کٹ جاتا ہے وہ دن
جس صبح ترے رخ کی تلاوت نہیں کرتے

جب ڈوب رہا ہوتا ہے خورشیدِ جہاں تاب
کہتے ہیں کہ سائے سے عداوت نہیں کرتے

دکھ ساتھ بہا لاتے ہیں آنسو ہوں کہ الفاظ
ہم اس کے لیے کوئی ریاضت نہیں کرتے

سن سکتے ہو زنداں کی فصیلوں سے وہ نوحے
دل پر جو گزرتی ہے عبارت نہیں کرتے

تلوار اٹھانے کی سکت ہو تو نکلنا
بیساکھی سے لشکر کی قیادت نہیں کرتے

عادت ہو جنہیں کٹ کے نمو پانے کی راحتؔ
وہ کاٹنے والوں کی سماجت نہیں کرتے

راحت سرحدی

غزل

فرازِ شرق سے سورج نکلتے جاتے ہیں
نشیبِ غرب کے مرگھٹ پہ ڈھلتے جاتے ہیں

ہمارے شہر کا چہرہ بدل نہیں پایا
دکان دار ہی چہرے بدلتے جاتے ہیں

یہ، ہم غریبوں کے اربوں پتی نمائندے
جہانِ زَر میں یہی لوگ چلتے جاتے ہیں

مقابلہ کہاں آتش فشاں پہاڑوں سے
کہ ہم تو موم کے بُت ہیں، پگھلتے جاتے ہیں

نظامِ کُہنہ کو دے کر دوام، عہد بہ عہد
اِسی الاؤ میں چپ چاپ جلتے جاتے ہیں

اُتارتے ہی نہیں قبر میں جنازے کو
عجیب لوگ ہیں، کندھے بدلتے جاتے ہیں

مجھے بچاؤ، کہ دلدل نے آلیا ہے مجھے
انیسِ جاں! مرے پاؤں پھسلتے جاتے ہیں

محمد انیس انصاری

غزل

لگتا ہے دیکھ کر ترے نقش و نگار کو
قدرت نے کر دیا ہے مجسم بہار کو

لایا ہے سحر سامنے تیرے جمال کا
ملتی ہے قدر اس لیے آئینہ دار کو

جن کے لیے عدم تری دوری کا نام ہے
کہتے ہیں زندگی ترے قُرب و جوار کو

جنت کے صبح و شام تصور میں آگئے
بخشے وہ رنگ عشق نے لیل و نہار کو

دستک محبتوں کی ہو در کھولتے نہیں
پھر ساری عمر ڈھونڈتے رہتے ہیں یار کو

ابلیس زادگان کو شاید خبر نہیں
بھائے صفت وکیل کی پروردگار کو

بنتا ہے آس کتنے مریضوں کے واسطے
بخشی گئی ہے کتنی سعادت انار کو

کلیوں کی آبرو کا محافظ ہے اور کون
گلزار داد پھول کو دو گے کہ خار کو

گلزار بخاری

غزل

کسی خیال میں دیوار و در سے ڈرتے ہوئے
بکھر گیا وہ محبت کی بات کرتے ہوئے

بہا کے لے گئے مجھ کو بھی سوچ کے ریلے
میں دیکھتا رہا دریاؤں کو بپھرتے ہوئے

نجانے اس نے کوئی بات کیوں چھپائی تھی
بدل رہا تھا وہ پہلو کئی مُکرتے ہوئے

مجھے تو آتا رہا اُس کی بے حسی کا خیال
وہ دیکھتا رہا آنکھوں میں اشک بھرتے ہوئے

اٹھا رہا ہے کوئی لُطف زندگانی کا
چلا گیا ہے کوئی ایڑیاں رگڑتے ہوئے

بُھلا دیا ہے کئی بار اپنے آپ کو بھی
ترے خیال کی گہرائی میں اُترتے ہوئے

وہی تو موردِ الزام خود بھی ہے ساجد
جو سوچتا نہیں الزام مجھ پہ دھرتے ہوئے

سید افسر ساجد

غزل

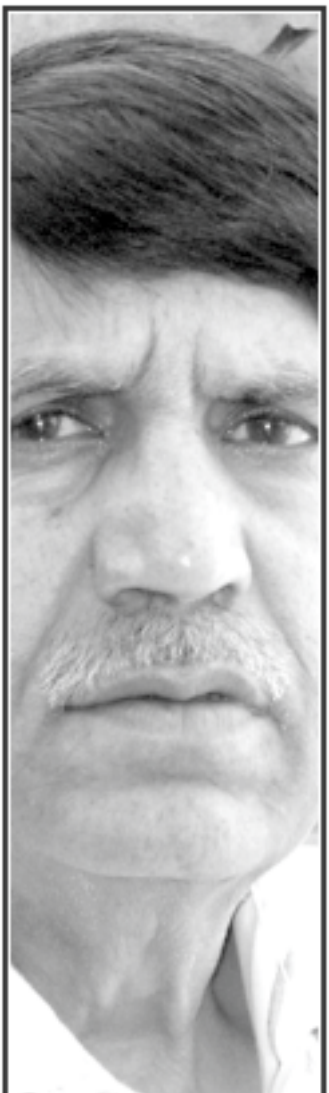

نام بھولے ہوئے اِک ساتھ اُٹھا لائی ہے
شامِ وحشت بھی مِرے کام بہت آئی ہے

لوگ جس دشت کی ہیبت سے مَرے جاتے ہیں
دِل نے اُس دشت میں جینے کی قسم کھائی ہے

شوق ایسا بھی نہ تھا مجھ کو رجز خوانی کا
بزم میں گھیر کے لائی مِری پسپائی ہے

ایک زنجیر گیا وقت لیے پھرتا ہے
ایک زنجیر محبت نے بھی پہنائی ہے

سَر اُٹھایا ہے قیامت سی کئی یادوں نے
یار کی یاد نے لی کیسی یہ انگڑائی ہے

جھوٹ اچھا نہیں لگتا ہے تو ہنس دیتا ہوں
میں کہاں بولتا ہوں فطرتِ گویائی ہے

گھِن سی آتی ہے یہاں ہاتھ ملاتے عظمیؔ
جھوٹ بننے لگی جب سے یہاں سچائی ہے

اسلام عظمی

غزل

وہ ماہتاب ہے ، ماہِ تمام لگتا ہے
ہے خاص میرے لئے ،سب کو عام لگتا ہے

نظر نظر سے ملے تو سُرور آتا ہے
مرے نشے کا یہی اہتمام لگتا ہے

سُکوت میں ہے صداؤں کا شور اک شامل
اکیلا ہے وہ مگر ہم کلام لگتا ہے

میں جانتا ہوں مُلاقات میں خموشی کو
نظر کا اُس کی جُھکانا، سلام لگتا ہے

جو آگ اس نے لگائی ہے میری پگڑی کو
یہ احتجاج نہیں ، انتقام لگتا ہے

قدم اٹھانے سے پہلے رہے یہ سوچ میں گُم
نفس یہ، عقل کا میری غُلام لگتا ہے

یہ شاعری مری اجمل ، تو اک عنایت ہے
عطائے رب مجھے اپنا کلام لگتا ہے

اجمل اعجاز

غزل

بچائے رکھنا خدایا جہاں پرندوں کے
اجڑ نہ جائیں کہیں آسماں پرندوں کے

ہر اک مچان پہ بیٹھے ہوئے شکاری ہیں
نشانوں پر ہیں سبھی آشیاں پرندوں کے

شجر پہ اڑتے پرندوں کا رقص جاری ہے
کسی نے بانٹے ہیں دکھ بے اماں پرندوں کے

ہے ان کے دم ہی سے چہکار زندگانی کی
فضا میں رنگ سجیں مہرباں پرندوں کے

انھی کی جان میں گویا بسی ہے جان مری
میں دیکھ ہی نہیں سکتا زیاں پرندوں کے

کسی سراب نے ان سے حیات چھینی ہے
پڑے ہیں دشت میں اب تک نشاں پرندوں کے

خدا کرے کہ سلامت رہیں یہ شہرِ پند
اُترتے دیکھوں سدا کارواں پرندوں کے

رواں دواں ہی رہیں منزلوں کی سمت نثار
کبھی نہ ہوں سفر رائیگاں پرندوں کے

نثار ترابی

غزل

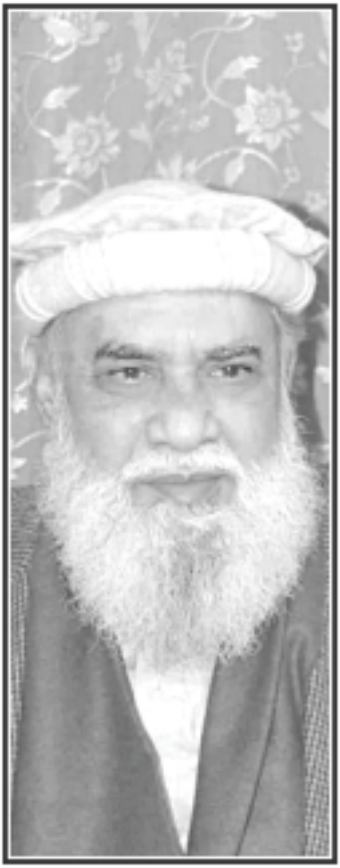

دیواروں کے کان ہوا کرتے ہیں میری مانو
لوگ بڑے شیطان ہوا کرتے ہیں میری مانو

جن کے منہ کو انسانوں کا خون لگا ہوتا ہے
ایسے بھی انسان ہوا کرتے ہیں میری مانو

کام سبھی مشکل ہوتے ہیں جب کرنے بیٹھو تو
دیکھنے میں آسان ہوا کرتے ہیں میری مانو

جن کو پڑھ کر سارا افسانہ نہیں پڑھنا پڑتا
ایسے بھی عنوان ہوا کرتے ہیں میری مانو

بچ کے رہنا اکرم ناصر یاروں کی جھولی میں
تہمت اور بہتان ہوا کرتے ہیں میری مانو

اکرم ناصر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہنستے ہنستے میں نے کہہ دی اپنی کہانی آج
تنہائی میں کب تک خالد کوئی بہائے نیر

غزل

صد شکر میرے جسم پہ اب سر نہیں رہا
مجھ کو شکاریوں کا کوئی ڈر نہیں رہا

مانا تمھارے صحن کی دیوار گر گئی
مجھ سے شکستہ بخت کا تو گھر نہیں رہا

کیوں دل دھڑکنے لگتا ہے پھر اس کے نام پر؟
جو شخص میری سوچ کا محور نہیں رہا

سب نے تمھارے نام پہ دیں اتنی دستکیں
دیوار رہ گئی ہے مگر در نہیں رہا

شکنیں پرانے سال کی چہروں پہ ہیں سجیں
اپنے لیے وہ سال بھی بہتر نہیں رہا

مرغابیاں بھی لوٹ کے آئیں نہ تیرے بعد
سُندر، سنہری، جھیل کا منظر نہیں رہا

کیا موسمِ بہار کی سانسیں اُکھڑ گئیں؟
شاخوں کے ساتھ کوئی گلِ تر نہیں رہا

کیوں چل رہی ہیں میرے مخالف یہ آندھیاں؟
میرے بدن پہ اب تو کوئی پَر نہیں رہا

اَب کس لیے ہوا میں چلاتے ہو گولیاں؟
اَب تو فضا میں کوئی کبوتر نہیں رہا

فیض و فراز و محسن و غالب چلے گئے
دُنیا میں اَب تو میر سا شاعر نہیں رہا

اِک دور تھا کہ پاس تھیں رنگین تتلیاں
اس عمر میں تو تتلی کا اک پر نہیں رہا

ہم کو ملی ہیں قرض کی بیساکھیاں عقیل
خوش بخت ہیں کہ گرنے کا اَب ڈر نہیں رہا

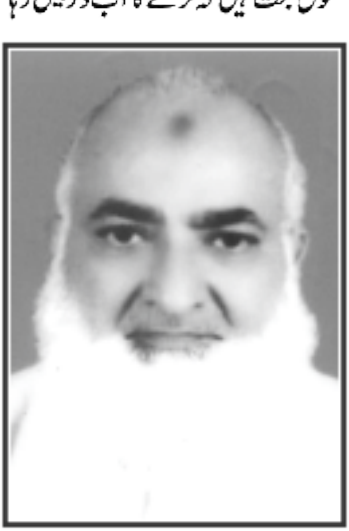

عقیل رحمانی

غزل

رضا اللہ حیدر

اگرچہ خواب تھی میری محبت کی کہانی بھی
بڑی شاداب تھی میری محبت کی کہانی بھی

مری زلفوں کو سہلاتے تھے رنگیں پنکھ تتلی کے
گل و مہتاب تھی میری محبت کی کہانی بھی

خرامِ ناز کرتی تھی کبھی تو آبشاروں میں
کبھی سیلاب تھی میری محبت کی کہانی بھی

کنول کا پھول چھونے کو جہاں دو ہنس رہتے تھے
وہی تالاب تھی، میری محبت کی کہانی بھی

انھی چشموں سے جو آنکھیں بہاروں میں بناتی تھیں
بہت سیراب تھی میری محبت کی کہانی بھی

اگرچہ لاکھ دہرائی ہوئی معلوم ہوتی ہے
رضا نایاب تھی میری محبت کی کہانی بھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہی بھائی، وہی بھاؤ، وہی قدریں خالد
کیا توقع کوئی لے کر سر بازار آئے

غزل

حیران ہوں امید بر آ کیوں نہیں آتی
کھڑکی ہے کھلی پھر بھی ہوا کیوں نہیں آتی

ہر شخص کو راس آ گیا کیا حبس کا موسم
ہونٹوں پہ کسی کے بھی دعا کیوں نہیں آتی

ہم دل کو جو ڈھانپیں تو کھلی رہتی ہیں آنکھیں
پوری ہمیں خوابوں کی ردا کیوں نہیں آتی

ہوں رسمِ محبت سے گلہ مند کہ اس کو
دل داریٔ اربابِ وفا کیوں نہیں آتی

دستک نے لگائی ہیں امیدیں ترے در سے
پھر چٹخنی کھلنے کی صدا کیوں نہیں آتی

کس شوق سے کرتے ہیں تماشائے اسیراں
اس شہر کے لوگوں کو حیا کیوں نہیں آتی

محراب کے باہر ہیں کئی قمقمے روشن
محراب کے اندر سے ضیا کیوں نہیں آتی

اس جرم پہ سانسوں پہ لگائے گئے پہرے
میں پوچھتا تھا بادِ صبا کیوں نہیں آتی

امید وہاں بیٹھی ہے کس زعم میں طالب
دُکانِ محبت کو بڑھا کیوں نہیں آتی

طالب انصاری

غزلیں

اے حُسنِ لازوال، ترے غم نے کر دیا
مجنوں سا میرا حال ترے غم نے کر دیا

مجھ کو تو اِک مثال ترے غم نے کر دیا،
اِتنا بڑا کمال ترے غم نے کر دیا

جو حال شہ مُرید تھا ہانی کے عشق میں
ویسا ہی میرا حال ترے غم نے کر دیا

اوجِ فلک پہ میرا ستارہ تھا، پھر اُسے
آماۂ زوال ترے غم نے کر دیا

اِک عُمر سے تھا مُنقطع میرا غموں سے ربط
پھر سے اِسے بحال ترے غم نے کر دیا

میں کیا جواب دوں گا اُسے قہقہوں کے بیچ
مجھ سے اگر سوال ترے غم نے کر دیا

دل کے سہارنے کو کئی لوگ مِل گئے
یوں ہجر کو وصال ترے غم نے کر دیا

خواہش نہیں رہی ہے مرے دل میں کوئی اور
ایسا مجھے نہال ترے غم نے کر دیا

اب پھر سے عِشق وشق کی ہمت نہیں رہی
مجھ کو بہت نِڈھال ترے غم نے کر دیا

اِک میں جو تیرے پاس ترے پیار میں ہُوا
سارا جہاں اُداس ترے پیار میں ہُوا

چُھوٹی ہُوئی تھیں کب سے مِری خُوش لِباسیاں
میں پھر سے خُوش لباس ترے پیار میں ہُوا

چادر خزَد کی اوڑھ کے سویا تھا جذبِ دل
لیکن یہ بے لباس ترے پیار میں ہُوا

کُچھ داسیوں کا خواب تھا، دل میں بسائیں وہ
لیکن میں دیوداس ترے پیار میں ہُوا

شعر و سُخن سے جس کا کوئی واسطہ نہ تھا
وہ بھی سُخن شناس ترے پیار میں ہُوا

اِک بار پھر سے آن بسے دل میں رنج و غم
اِک بار پھر اُداس ترے پیار میں ہُوا

میں خُود کو ڈھونڈنے میں پھرا کُو بہ کُو صنم
میں اتنا بدحواس ترے پیار میں ہُوا

کُھلنے لگی ہیں مجھ پہ مِری ذات کی تہیں
عُظمیٰ میں خُود شناس ترے پیار میں ہُوا

عُظمیٰ جون

غزل

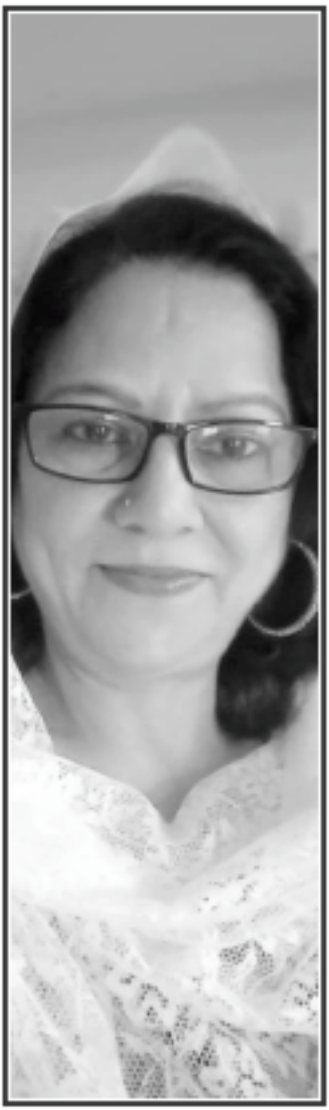

یہ جو چہرے نئے سجنے لگے ہیں
انہیں سب دیکھ کے ڈرنے لگے ہیں

یہ کیسی کیفیت ہے اضطراری
کہ ہم ہنستے ہوئے رونے لگے ہیں

بھنور کی زد میں ہے اب موج دریا
خس و خاشاک سب بہنے لگے ہیں

ہمارے خواب کے کیوں محل سارے
بنا تعمیر کے ڈہنے لگے ہیں

الٰہی خیر ہو اردو ادب کی
کہ جہلاء شعر اب کہنے لگے ہیں

نہ جانے وسوسے یہ کس طرح کے
تصور میں مرے رہنے لگے ہیں

یہ بندھن ضبط کا ٹوٹا ہے جب سے
''ہمارے اشک اب بہنے لگے ہیں''

کلائی کی مری یہ ہتھکڑی بھی
انہیں افروز کے گہنے لگے ہیں

افروز رضوی

غزل

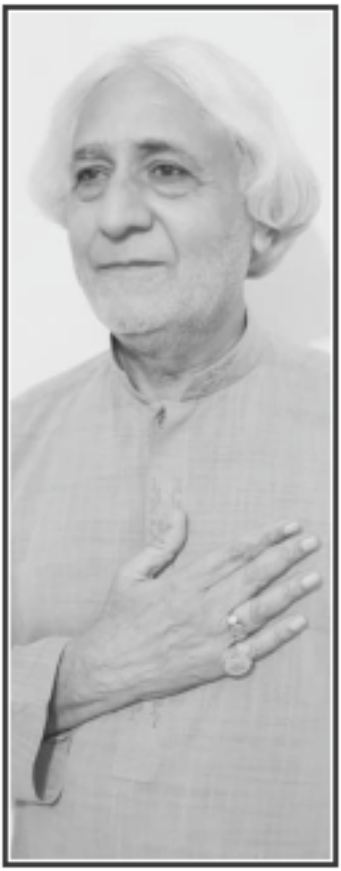

اس شہر سے اِک رشتہ ، برسوں کا پرانا ہے
ماضی کی حسیں یادیں ، بچپن کا زمانہ ہے

اے شہر کے لوگو! تم اتنی سی جگہ دے دو
ارمان بھرے دِل کو ، یاں لا کے بسانا ہے

اس شہر سے اُس جانب ، اِک شہرِ خموشاں ہے
اُس شہرِ خموشاں میں ، دلبر کا ٹھکانہ ہے

الفاظ کی بندش میں مستور ہے حالِ دِل
شعروں کے بہانے سے ، دُکھ درد سنانا ہے

اقبال وصیت ہے بس ایک ہی پیاروں کو
یادوں کا دِیا ہر شب ، مرقد پہ جلانا ہے

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ثانی تمازتوں میں بھی اُس کا کوئی نہ تھا
وہ شخص تیرگی میں فقط روشنی نہ تھا

غزلیں

ملتا نہیں ہے سینے میں اب تو نشانِ دل
برباد ہو چکا ہے مکمل ، مکانِ دل

مدت ہوئی ہے روٹھ چکی ہے بہارِ نو
عبرت سرائے دہر ہے اب، گلستانِ دل

محفوظ ، بحرِ غم میں رہے کشتیٔ حیات
وابستہ تیرے نام سے ہے بادبانِ دل

اک چاند، چھپ گیا ہے جو بدلی کے اوٹ میں
تاریک ہو چکا ہے سراسر، جہانِ دل

سو بار جرمِ عشق کا دل معترف ہوا
سو بار مسترد ہوا لیکن ، بیانِ دل

گنجِ دلِ حزیں میں ہیں کیا کیا رموزِ عشق
لیکن، نہ کوئی سمجھے، جہاں میں زبانِ دل

خوبانِ شہر ، زخم لگاتے رہے ، مگر
شوکت ، کبھی نہ بند ہوا آستانِ دل

شوکت محمود شوکت

اک درد سا ہوتا ہے درونِ دلِ وحشی
غارت ہے ازل ہی سے سکونِ دلِ وحشی

پابندِ سلاسل ہو کہ صحرا میں مقید
تخفیف نہیں پائے ، جنونِ دلِ وحشی

مشہور ہے دنیا میں ترا طرزِ تغافل
چل جائے نہ تجھ پر بھی فسونِ دلِ وحشی

اس زلف سیہ فارم پہ اژدر کا گماں ہو
اس چشم کی سرخی میں ہے خونِ دلِ وحشی

کہتا ہے غزل آج بھی شوکت، مگر اس میں
اب ہو نہ بیاں ، حالِ زبونِ دلِ وحشی

غزل

جہاں پہ نقش کھدے تھے ہمارے ناموں کے
قضا کا رزق ہوئے ہیں وہ پیڑ آموں کے

وگرنہ ساری کہانی ہماری اپنی ہے
بدل دیئے ہیں ذرا نام کچھ مقاموں کے

ترے بغیر بھلا کچھ نہیں لگا ورنہ
وہی شجر ہیں وہی سلسلے ہیں شاموں کے

یہ شہنشاہِ معظم کی مہربانی ہے
خود اپنے ہاتھ سے کاٹے ہیں سر غلاموں کے

میں انکو ٹھنڈا کروں بھی تو کس طرح آخر
الاؤ چاروں طرف ہیں یہ انتقاموں کے

میں خود کو بھول گیا بھولنے کی کوشش میں
وہ سب اشارے ترے دلنشیں پیاموں کے

دل و نظر کی سفارت بغیر لفظوں کے
تبادلے وہ محبت بھرے سلاموں کے

اگر یہ پانسا کسی روز سیدھا پڑ گیا تو
خرید لائیں گے یوسف بغیر داموں کے

میں کیسے ٹوٹ گیا جوڑنے کی کوشش میں
جہاں سے ٹوٹے تھے وہ سلسلے کلاموں کے

یہ زندگی نے وفا مجھ سے کی نہیں ورنہ
میں کیسے چھوڑتا دفترِ ادھورے کاموں کے

مسعود احمد

غزل

میتھیو محسن

کریں کیسے بیاں غم کی زمیں ہم
کہ زندہ لگتے ہیں زندہ نہیں ہم

کچھ ایسے بکھری ہے ہستی ہماری
جہاں میں تم نہیں تم ، ہم نہیں ہم

ہوئی ہیں راکھ اُمیدیں ہماری
ترے وعدے پہ کرلیں کیوں یقیں ہم

ہمیں پروا نہیں دیر و حرم کی
اٹھائیں تیرے در سے کیوں جبیں ہم

یہ نادانی ہے یا دانائی محسن
کہیں ہر ہر ستم پر آفریں ہم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ ایسے زور سے کڑکا فراق کا بادل
لرز اُٹھا کوئی پہلو میں ، ڈر گئے ہم بھی

غزل

مظہر امام

لوگ میری نہ حقیقت سمجھے
گزرے وقتوں کی عبارت سمجھے

بات کی میں نے اگر سنجیدہ
میرے احباب شکایت سمجھے

کاش ناراض وہ رہنے والا
میری خاموش محبت سمجھے

جو بھی گزری ہے سہی ہنس ہنس کر
جو بھی تھا حکم مشیت سمجھے

کچھ نہ تھا ایک تکلف کے سوا
ہم جسے تیری عنایت سمجھے

شہر کے لوگوں سے گھل مل کے امام
کوئی تو تیری طبعیت سمجھے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بام و فلک اُجاڑ کر رکھ دیئے کھیل کھیل میں
میرے پَر اُس نے جھاڑ کر رکھ دیئے کھیل کھیل میں

غزل

کہتے ہیں سبھی ، پر نہیں لگتا ویسے
ہے میرا کوئی گھر ، نہیں لگتا ویسے

یہ دل کہ عجب طور سے یوں بند ہوا ہے
تھا اس میں کبھی دَر ، نہیں لگتا ویسے

ہر یاد پہ ہے دھول جمی وقت کی ایسی
وہ تھا مجھے ازبر ، نہیں لگتا ویسے

ڈرتے ہوئے گزری ہے مری عمرِ گزشتہ
اور اب مجھے وہ ڈر نہیں لگتا ویسے

خوش ہوتا ہے کمزور پہ ہاتھ اپنا اُٹھا کر
کچھ بھی ہو ، دلاور نہیں لگتا ویسے

برتر نظر آتا ہے جو تمغوں کو سجا کر
کردار میں بر تر نہیں لگتا ویسے

سمجھے تھے کہ آرام سے جی لیں گے ترے بِن
پر دل کہ کہیں پر نہیں لگتا ویسے

شبہ طراز

غزل

وحشتوں سے گزر گئے ہم بھی
جو نہ کرنا تھا کر گئے ہم بھی

تم نے ایسے ہی آ لیا ہم کو
تم پہ ایسے ہی مر گئے ہم بھی

شدتیں اب کہاں وہ پہلی سی
اُس کے دِل سے اُتر گئے ہم بھی

تم دِکھائی نہیں دیے ہم کو
گرچہ حدِ نظر گئے ہم بھی

کوزہ گر تیری چاہتوں کے سبب
چاک پر پھر سنور گئے ہم بھی

عشق نے ہی سمیٹ رکھا تھا
وائے قسمت بکھر گئے ہم بھی

ہم کو یوں بے گھری نے آن لیا
ہو گئے پھر سے دربدر ہم بھی

طلعت شبیر

غزل

صورت اشک وہ آنکھوں میں بسائے گا مجھے
اپنی پلکوں کے دریچوں میں چھپائے گا مجھے

میرے احساس کو پژمردہ کیا ہے جس نے
خوابِ غفلت سے وہ اک روز جگائے گا مجھے

مجھ سے وہ دور رہے گا تو رہے گا کب تک
اک نہ اک روز وہ سینے سے لگائے گا مجھے

جانتا ہوں مجھے نظروں سے گرائے گا مگر
ناز و انداز سے پھر خود ہی اٹھائے گا مجھے

اس کو بھی ہوگی کبھی میری ضرورت درپیش
دشتِ گم نامی سے وہ ڈھونڈ کے لائے گا مجھے

جو بظاہر مجھے خاموش نظر آتا ہے
داستاں اپنی بہرحال سنائے گا مجھے

اپنی ہر بات چھپاتا ہے جو مجھ سے دانش
ایک دن دیکھنا ہم راز بنائے گا مجھے

اعجاز دانش

غزل

گہری ہے دھند شامِ سفر بے چراغ ہے
حدِ نگاہ _ راہگزر _ بے چراغ ہے

دل بے بصر ہے، ذہن پہ چھائی ہے تیرگی
مدت سے آگہی کا نگر بے چراغ ہے

اندھیر!! فرقِ خالق و مخلوق مٹ گیا
میری طرح خدا کا بھی گھر بے چراغ ہے

ہر طاقچے میں دیتی ہے لو یادِ رفتگاں
مانا تمام شہرِ نظر بے چراغ ہے

اے جانِ بزم آ کہ ہو روشن دل شہاب
تجھ بن سرائے شمس و قمر بے چراغ ہے

شہاب صفدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ ایسے زور سے کڑکا فراق کا بادل
لرز اُٹھا کوئی پہلو میں ، ڈر گئے ہم بھی

غزل

جب اپنے شوق کی میں انتہا کو دیکھتا ہوں
کسی بھی زخم کی پھر کب دوا کو دیکھتا ہوں

مجھے جب ایسا لگے میرا اور کوئی نہیں
میں آسمان کی جانب خدا کو دیکھتا ہوں

یہ چلتے چلتے رکاوٹ کہاں سے آئی ہے
کبھی میں ناؤ کبھی ناخدا کو دیکھتا ہوں

بس ایک یاد ہے جو چھوڑتی نہیں مجھ کو
میں دشتِ غم میں اسی باوفا کو دیکھتا ہوں

میں تیری ذات میں دن رات الجھا رہتا ہوں
میں تیری آنکھ میں ارض وسما کو دیکھتا ہوں

نجانے اس کے تصور میں خوش نصیب ہے کون
حنا بدست جو دستِ دعا کو دیکھتا ہوں

ہر ایک شخص جہاں آگے بڑھتا جاتا ہے
وہاں میں اپنے لیے التوا کو دیکھتا ہوں

محمد اشرف کمال

غزل

جہاں تک گیا خلا سے باہر نہیں گیا
کوئی راستہ فنا سے باہر نہیں گیا

اگر فکر تھی تو خال و خد سے جُڑی ہوئی
کوئی جسم کی فضا سے باہر نہیں گیا

ہے اپنی بقا کی جنگ یہ عاشقی تمام
تو ہم میں کوئی بقا سے باہر نہیں گیا

گو اس دشتِ عاشقی میں لمبا سفر کیا
میں مٹی کی اشتہا سے باہر نہیں گیا

دوا کا نہیں تھا کچھ مرے درد پر اثر
مگر چارہ گر دوا سے باہر نہیں گیا

گو موقع دیا سبھی کو اس شب حسین نے
مگر کوئی کربلا سے باہر نہیں گیا

کبھی جب اُٹھائے ہاتھ ماں نے مری حبیب
تو پھر کچھ بھی اس دعا سے باہر نہیں گیا

بشیر احمد حبیب

غزل

بکھری سانسوں کا انتشار گیا
بجھ گئی آنکھ انتظار گیا

زندگی بھر میں اس سے جیتا تھا
آخرش موت سے میں ہار گیا

اس طرح سے گیا وہ جیون سے
جس طرح موسمِ بہار گیا

کس لئے موت سے گلہ کیجے
میرا جیون ہی مجھ کو مار گیا

ہر کوئی اس پہ جان دیتا تھا
اس لیے میں بھی ہو نثار گیا

ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں اسکو جلیل
کہکشاؤں کے آر پار گیا

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

باندھا گیا ہے جسم کے پتھر سے کیوں مجھے
نفرت ہے آپ اپنے ہی پیکر سے کیوں مجھے

غزل

مختی سوئیں سڑک پر رہنے کو بھی گھر نہیں
کھا چکے ہیں مُلک کو جو اُن کو کوئی ڈر نہیں

وہ ترا کھڑکی میں آنا ، چوری چوری دیکھنا
آج بھی لوگو میں بھولا وہ حسیں منظر نہیں

عشق کی معراج تک اُس کا پہنچنا ہے محال
جس کسی کو عشق کے اسباق تک ازبر نہیں

مغربی تہذیب نے قدریں ہماری چاٹ لیں
بیٹیوں ، ماؤں کے سر پہ اسلئے چادر نہیں

سب کے سب انسان ہیں تخلیق رب کی ذات کے
اور کوئی انسانیت میں بالا و کمتر نہیں

کہہ رہا ہوں ڈاکوؤں سے آؤ آ کر لوٹ لو
میرے گھر میں ہیں کتابیں لوٹنے کو زر نہیں

داخل جنت وہ شاہد ہو نہ پائے گا کبھی
جو محمد مصطفٰے کی آل کا چاکر نہیں

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

عشق کا روگ جی سے چھٹ جاتا
غم سے دل جو کہیں یہ پھٹ جاتا

جانے کب کا یہ دل پلٹ جاتا
ایک وعدہ مگر لپٹ جاتا

آتے آتے تمھاری چوکھٹ تک
پیار کا معنی ہی اُلٹ جاتا

پھیل جاتی ہے شے تمازت سے
دھوپ میں سایہ ہے سمٹ جاتا

راہ سے زندگی کا یہ پتھر
ابدی نیند سے تو ہٹ جاتا

مجتمع حوصلہ جو کرتے تھے
روز وہ سب کا سب ہی بٹ جاتا

یوں تعلق کو توڑ لینے سے
دل کا کیا رابطہ بھی کٹ جاتا

لڑ بھی سکتا تھا دل محبت میں
حوصلہ دیتے وہ تو ڈٹ جاتا

پاؤں دھر لیتی جو خوشی دل میں
غم کا بادل بھی خود ہی چھٹ جاتا

عمرِ رفتہ کا یہ طویل سفر
چلتے رہتے اگر تو گھٹ جاتا

خوشی آنے سے پیشتر ہی دل
گردِ غم سے ہمیشہ اَٹ جاتا

خالدہ انور

غزل

اپنی قیمت بڑھا کے دیکھا تھا
اس کو دل میں بٹھا کے دیکھا تھا

سرمئی آدھے، آدھے کالے بال
ایک دن پاس جا کے دیکھا تھا

اس کو چھونے کی آرزو پیہم
ہاتھ دونوں بڑھا کے دیکھا تھا

بزم میں جس طرف نظارے تھے
پوری کرسی گھما کے دیکھا تھا

ماہتاب اتنی دور تھا ہم سے
بادلوں کو ہٹا کے دیکھا تھا

دیکھ سکتی تھی گھپ اندھیرے میں
کب دیے کو جلا کے دیکھا تھا

سانولا سانولا ہوا سب کچھ
جب بھی کاجل لگا کے دیکھا تھا

پھر کہیں دیکھ پائی قامت سرو
اُس کو ایڑی اُٹھا کے دیکھا تھا

لوگ پتھر کے ہوتے جاتے تھے
جس کو بھی مسکرا کے دیکھا تھا

دیکھا، اس کو نہ کوئی دیکھ سکے
کالا چشمہ لگا کے دیکھا تھا

کس قدر لوگ دیکھتے ہیں اُسے
اپنی آنکھوں سے جا کے دیکھا تھا

رخشندہ نوید

غزل

بعض اوقات یہ اِمکان بڑا ہوتا ہے
خواب چھوٹا تو شبستان بڑا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے حقیقت میں زیادہ مشکل
کام جو خواب میں آسان بڑا ہوتا ہے

میرے قد کو نہیں کردار کو دیکھا جائے
قد ہو چھوٹا بھی تو اِنسان بڑا ہوتا ہے

میرے بارے میں جو سُنتا ہے مرے دُشمن سے
دیکھ کر مُجھ کو وہ حیران بڑا ہوتا ہے

اپنی آنکھوں میں بسا تو مَیں تُجھے لُوں لیکن
بارشوں کا یہاں اِمکان بڑا ہوتا ہے

ہجر کے بارے میں اِتنا ہی بتا سکتا ہوں
یہ وہ رستہ ہے جو سُنسان بڑا ہوتا ہے

چھوڑتا دیس ہے جو شخص خُوشی کی خاطر
جا کے پردیس پریشان بڑا ہوتا ہے

فلسفی عقل کی عظمت کو بیاں کرتے رہے
صُوفی کہتے رہے وجدان بڑا ہوتا ہے

ہم ہیں وہ پست خیالات کے شاعر، جن کا
شعر ہو یا نہ ہو ، دیوان بڑا ہوتا ہے

عِشق بازار ہی ایسا ہے کہ جس میں کیفی
نفع ہوتا نہیں ، نقصان بڑا ہوتا ہے

محمود کیفی

غزل

مجھکو وہ پیار کے لمحات ، دوبارہ دے دے
سہل یہ عمر کٹے ، پیار ادھارا دے دے

چل مرے ساتھ کبھی، پھر سے انہی راہوں پر
میرے شانے پہ وہی ہاتھ، سہارا دے دے

تو نے تو ساتھ بدل ڈالا ہے اور نظریں بھی
ایسا کر وقت مرا، جو بھی، گزارہ دے دے

میری کشتی تو سدا سے ہی ہے، طوفانوں میں
اس کو اب جان مری، کوئی کنارہ دے دے

نیند کا غلبہ ہے، اور وقت بھی کافی ہے ہوا
اب تو کوکی! کوئی، سونے کا اشارہ دے دے

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جسم کے پار کون دیکھے گا!
روح کا بار کون دیکھے گا!

غزل

انصر حسن

اُس گھر کے در و بام ، نہیں ایسا نہیں ہے
سجتے ہیں سرِ شام ، نہیں ایسا نہیں ہے

صدیوں سے مری تشنہ لبی دیکھنے والا
بھر دے گا مرا جام ، نہیں ایسا نہیں ہے

میں تیرے تجسّس میں ابھی گھوم رہا ہوں
اے وادیٔ گُم نام ، نہیں ایسا نہیں ہے

ہم زاد سے ہو گا نہ پری زاد سے ہو گا
مشکل ہے مرا کام ، نہیں ایسا نہیں ہے

انجان سی ، نادان سی ، مرجان سی لڑکی
کر لے گی مجھے رام ، نہیں ایسا نہیں ہے

میں دیکھ رہا ہوں کہ دل دہر میں انصر
چُبھتا ہے مرا نام ، نہیں ایسا نہیں ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پیڑ کب ؟ دامنِ صحرا پہ ہَرے دھبّے ہیں
ثُو کہاں؟ حرف کی مٹّھی میں ترے ریزے ہیں

غزلیں

زمانے کو کہانی چاہیے بس
کہانی پُرمعانی چاہیے بس

اچانک ٹوٹ کر بکھرا ہے یہ دل
سفر اب ناگہانی چاہیے بس

بچھڑ کر بھی وہ میرا ہمسفر ہے
اسے میرا ہی ثانی چاہیے بس

زوالِ عمر کی دہلیز پر اب
کچھ اک پل کی جوانی چاہیے

جھلس جائیں گے ورنہ ہجر لمحے
مری آنکھوں کو پانی چاہیے بس

ہمارے خواب سب بے رنگ رکھے
اسے تعبیر دھانی چاہیے بس

ثمینہ دل تو بچہ ہے ہمارا
کھلونا آسمانی چاہیے بس

ثمینہ سیّد

گزر رہی ہوں ابھی دائرے بناتی ہوئی
رہِ وفا میں نئے زاویے بناتی ہوئی

وفا پرست نہیں ہوں تو اور کیا ہوں میں
کہ زخم زخم ہوئی آئنے بناتی ہوئی

ریاضتوں سے بھرا تجربہ سلامت ہے
رکی ہوئی ہُوں مگر سلسلے بناتی ہوئی

عجب طرح سے مقدر نے رنگ بدلے ہیں
میں ٹوٹ پھوٹ گئی رابطے بناتی ہوئی

ثمینہ ٹوٹ نہ جائے کہیں بھرم اپنا
بھٹک گئی ہُوں فقط راستے بناتی ہوئی

غزل

تمھارے جانے کے بعد ہم پر یہ کیسے موسم گزر گئے ہیں
ہماری نیندیں اجڑ گئی ہیں ہمارے سپنے بکھر گئے ہیں

نہ اعتبار سحر رہا ہے نہ لذت شام اب ہے باقی
وہ جن کے پہلو میں زندگی تھی وہ لمحے جانے کدھر گئے ہیں

جو بارشوں میں چڑھے ہوئے تھے جو ساونوں میں بڑھے ہوئے تھے
وہ سارے دریا تو لگتا ہے اب ہمارے اندر اتر گئے ہیں

عجیب ہوتے ہیں یہ محبت کا روگ دل کو لگانے والے
خوشی میں مرجھا گئے تھے لیکن اداسیوں میں نکھر گئے ہیں

جنھوں نے اپنا لہو بہا کر کھلائے تھے پھول اس زمیں پر
قیامت ان پہ کوئی تو گذری کہ آج ہجرت وہ کر گئے ہیں

گھنے اندھیرے میں رہنے والے وہ رات کا جبر سہنے والے
دلوں کو دھڑکا لگا یہ کیسا کہ صبح ہوتے ہی ڈر گئے ہیں

محبتوں میں کبھی نہ آیا خیال سود و زیاں کا شوکتؔ
کسی کی چاہت میں جی اٹھے ہیں کسی کی الفت میں مر گئے ہیں

افتخار شوکت

غزل

اگر نہیں تجھے معلوم راستا یارا
ادھر ادھر نہ مجھے اس طرح گھما یارا

ترے نقوش تراشے مرے تخیل نے
ترا جمال مرے شعر سے سجا یارا

میں اس کو پیار سمجھ کر سنبھال لیتا تھا
تو احترام کی سوغات بانٹتا یارا

بدن کا بارِ گراں بیچ سے ہٹا ہی نہیں
رسائی روح تلک پا نہیں سکا یارا

ہر ایک پھول میں خوشبو نہیں ہوا کرتی
ہر ایک شخص نہیں پیکرِ وفا یارا

جو بھر گیا مری غفلت سے وقت کے ہاتھوں
وہ ایک زخم نہیں مجھ کو بھولتا یارا

بغیر اس کے عجب بے کلی سی رہتی ہے
لگا ہے درد کا یوں دل کو ذائقہ یارا

مرے خیال میں یہ ڈوبنے سے بہتر ہے
کہ خود سنبھال لیں ہم کارِ ناخدا یارا

نکات ڈھونڈ لیے جائیں مشترک جاذبؔ
تو اختلاف میں کیا ہے مضائقہ یارا

اکرم جاذب

غزل

کوئی اِس شہر میں زندہ نہیں ملتا
گماں توڑوں پر آئینہ نہیں ملتا

نہ جانے کون ہوں میں، کس نگر میں ہوں
کہیں کوئی لبِ گویا نہیں ملتا

عجب متروک صحرا ہے کہ ڈھونڈے سے
مسافر کیا کوئی خیمہ نہیں ملتا

اُٹھا لو مفت جو بھی دل پسند آئے
در ایں بازار کچھ سستا نہیں ملتا

یہ دریا کا سفر ٹھہرا میاں اِس میں
نہ ہو گر ابر تو سایہ نہیں ملتا

اگر قسمت سے مل جائے کوئی رستہ
تو پھر انبوہ میں رستہ نہیں ملتا

مری تنہائی میرے ساتھ ہوتی ہے
کسی سے میں کبھی تنہا نہیں ملتا

حسنین سحر

غزلیں

وہی دوستوں کی بہار تھا جو نہیں رہا
میرا ایک ہی تو وہ یار تھا جو نہیں رہا

وہ تھا بانسری یا رباب تھا کوئی غمزدہ
کسی شبھ گھڑی کا ستار تھا جو نہیں رہا

کسی اور کا نہ خیال تھا نہ ملال تھا
وہی ایک مجھ کو ہزار تھا جو نہیں رہا

وہ یہیں تو تھا وہ کہاں گیا اسے ڈھونڈیے
کسی قافلے کا غبار تھا جو نہیں رہا ؟

میرے چاروں اور فریب تھا یا سراب تھا
کوئی ذہن و دل پہ سوار تھا جو نہیں رہا

خالد ندیم شانی

ایسا تھوڑی ہے کہ آباد نہیں رہتا ہے
دل ترے بعد مگر شاد نہیں رہتا ہے

اپنی مرضی سے بناتا ہے دل اپنا پنجرہ
یہ کبوتر کبھی آزاد نہیں رہتا ہے

اتنی شدت سے وہ لگتا ہے مرے سینے سے
سانس لینا بھی مجھے یاد نہیں رہتا ہے

تو سکوں ساتھ لیے جاتا ہے جب جاتا ہے
ایک لمحہ بھی ترے بعد نہیں رہتا ہے

کونسا عشق لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
شیریں مر جائے تو فرہاد نہیں رہتا ہے

کسی چنگیز کو غدار اگر مل جائیں
چاہے بغداد ہو بغداد نہیں رہتا ہے

تم نے جس شے کو بھی مانا ہے خدا کو مانا
کوئی تسلیم ہو ، الحاد نہیں رہتا ہے

کیسی افتاد عدالت پہ پڑی ہے خالد
چھوڑ دیں پنچھی تو صیاد نہیں رہتا ہے

غزل

تیرے بغیر بھی تری صحبت میں آ گیا
میں اچھے راویوں کی روایت میں آ گیا

تیاری خاص کی نہیں دُنیا میں آنے کی
جس حال میں تھا میں اُسی حالت میں آ گیا

بازارِ زندگی میں یہ نیکی خرید لی
اور اک گناہ بھی اِسی قیمت میں آ گیا

ہمراہ لے کے آنا تھا واں سے خدا کو بھی
اب کیا کہوں کہ میں بڑی عجلت میں آ گیا؟

جو بازوؤں کے گھیرے میں آتا نہ تھا کبھی
خود چل کے میرے حلقۂ حیرت میں آ گیا

زندانیوں میں تیرے کوئی مجھ سا ہے کہیں؟
کیسا کھلا میں تیری حراست میں آ گیا

وحدت سے اپنی جان چھڑا کر اک آدمی
واپس چلا تو نرغۂ کثرت میں آ گیا

دروازہ تھا اگر تو نظر آیا کیوں نہیں
دستک بغیر میں تری خلوت میں آ گیا

کچھ لوگ بات کرتے دکھائی دیے کہیں
اور اک بیان تیری حمایت میں آ گیا

سب خون خون کرتے ہیں، کچھ اور بھی کریں
میں زندگی کی کون سی دعوت میں آ گیا؟

شاہین عباس

غزل

عشق میں جو بدنام نہ ہوتے
رسوا صبح و شام نہ ہوتے

رہتا ہوں ہر وقت سفر میں
درد صدائے عام نہ ہوتے

ہوش میں رہنا مشکل تھا جو
ساقی تیرے جام نہ ہوتے

دنیا پتھر جیسی ہوتی
گر نازک اندام نہ ہوتے

کر سکتے تھے ایک محبت
ہم جو دل آرام نہ ہوتے

وقت شفیق انصاری میرا
سپنے کیونکر رام نہ ہوتے

محمد شفیق انصاری

غزل

خوشیوں کا چاند دل کے فلک سے اتر گیا
جانا کسی کا آنکھ میں اشکوں کو بھر گیا

شامیں اُداس ہیں مری، دن بھی اداس ہیں
موسم کسی کے ہجر کا دل میں ٹھہر گیا

رخصت کے وقت مجھ پہ کھلا زندگی کا راز
بے کار کس قدر مرا سارا سفر گیا

آئے ہیں زخم روح پہ خود کو سمیٹتے
گر کر تمھارے ہاتھ سے اتنا بکھر گیا

ہر بار تیری یاد نے بانہوں میں بھر لیا
آوارگی سے تھک کے کبھی گھر اگر گیا

میں نے اُسے کہا ترا ہنسنا کمال ہے
اک دن وہ اپنے پیار سے ہنس کر مکر گیا

میرے بغیر ایک بھی لمحہ محال تھا
میرے بغیر آپ کا جیون گزر گیا؟

اکمل! سناؤں کس کو میں اپنی یہ بے بسی
اک دوست خامشی سے عجب موت مر گیا

اکمل حنیف

غزل

کیسے لوگ تھے جن کے اپنے کان نہیں تھے
بے رنگ آنکھوں میں دہکے لوبان نہیں تھے

سونا بھی بے رنگ پیتل کی شہ بکتا تھا
ہیرے بکھرے پتھر تھے یک جان نہیں تھے

بات برائے بات ہمکتی ہی جاتی تھی
وہم سنپولے لیکن اربستان نہیں تھے

بجھتی کرنیں روشن لے میں چیخ رہی تھیں
حیرت کے یہ کنکر قبرستان نہیں تھے

لکڑی نے کلہاڑی پر اک وار کیا تھا
لپک جھپک تھی لوہے میں وجدان نہیں تھے

یادوں کے صندوق میں بھی تو نم دھرا تھا
ورق پھٹے تھے وعدوں کے ہنستان نہیں تھے

سعدیہ بشیر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزلیں

میں سچ کہوں بھی اگر وہ تو مانتا ہی نہیں
مجھے وہ جانتا ہے پھر بھی جانتا ہی نہیں

میں کیسے مان لوں وہ دوست ہے مرا اب بھی
کہ اپنے درد تو وہ مجھ سے بانٹتا ہی نہیں

سوائے حسرتوں کے کچھ نہیں ملا مجھ کو
مرا یہ دل بھی اُسے اب تو مانگتا ہی نہیں

اُسے خبر نہیں ہے آئنے پہ کیا گزری
وہ میرے دل میں کبھی آ کے جھانکتا ہی نہیں

فریب کھائے ہیں میں نے تو ہے سبب اِس کا
ملے جو پیار سے میں اُس کو جانچتا ہی نہیں

ہوا کا ڈر نہیں جبرانؔ اب رہا باقی
شجر کا آخری پتا ہے کانپتا ہی نہیں

وسیم جبران

مرے گاؤں کا گھر، آنگن وہی ہے
جو رستے میں تھا اک جامن وہی ہے

مرا دل بھی وہی، دھڑکن وہی ہے
بتا گوری! ترا ساجن وہی ہے

پرندے ہیں یہاں ناں پیڑ کوئی
سنا تھا میں نے یہ گلشن وہی ہے

پسِ دیوار ہے اب کون اپنا
دریچے پر مگر چلمن وہی ہے

نہیں اک بوند پانی اب میسر
ہماری پیاس اور برتن وہی ہے

ہمیں لوٹا گیا چہرے بدل کر
وہی وعدے ہیں اور بھاشن وہی ہے

نہیں اب سامنے کوئی بھی صورت
مگر جبران یہ درپن وہی ہے

غزل

جنھیں عروج ملا تھا حواریوں کی طرح
پڑے ہوئے ہیں زمیں پر بھکاریوں کی طرح

کچھ اس طرح بھی غلامی کے داغ دھلتے ہیں
پرند قید میں رکھیں اڈاریوں کی طرح

یہ طفل سنگ اٹھائے ہوئے پرندوں پر
نکل پڑے ہیں گھروں سے شکاریوں کی طرح

شکست کھا کے بھی کچھ لوگ معتبر ٹھہرے
کسی کو جیت ملی ہے بھکاریوں کی طرح

نہ جانے کون سی دیوی یہاں سے گذرے گی
کھڑے ہوئے ہیں مسافر پجاریوں کی طرح

کوئی نیا ہی تماشا دکھانے والے ہیں
ہمارے شہر کے بچے مداریوں کی طرح

ہم ایک عمر سے گاڑی کے انتظار میں ہیں
نئے جہاں میں، پرانی سواریوں کی طرح

امیرِ وقت کے الفاظ وار کرتے ہیں
مرے وجود پہ چلتے ہیں آریوں کی طرح

بکھرتے دیکھا ہے اک ایسے شخص کو میں نے
جو خود کو ہار چکا تھا جواریوں کی طرح

مرے مزاج میں نخوت کا در نہیں کھلتا
میں دشمنی بھی سمجھتا ہوں ہاریوں کی طرح

محمد نوید مرزا

غزل

دل سے اب خوف نکالا نہیں جاتا ہم سے
سنگ کو موم میں ڈھالا نہیں جاتا ہم سے

زخم بھر پائے نہیں پچھلے برس کے بھی ابھی
روگ تازہ کوئی پالا نہیں جاتا ہم سے

پچھلے موسم کے مراسم نہیں توڑے جاتے
وہ اگر آئے تو ٹالا نہیں جاتا ہم سے

دل میں اِک غم تری یادوں کا ٹھہرنے والا
درد ایسا ہے سنبھالا نہیں جاتا ہم سے

اِن اندھیروں کا تماشا نہیں تھمنے والا
شبِ تیرہ کو اُجالا نہیں جاتا ہم سے

ہم تری راہ کی دیوار ہٹا دیتے ہیں
کوئی رستہ جو نکالا نہیں جاتا ہم سے

جب تلک بھوک نہ مٹ جائے زمانے بھر کی
اپنے منہ میں بھی نوالا نہیں جاتا ہم سے

ہم حصارِ غمِ اُلفت کے اسیر ایسے ہوئے
یوں ترے پیار کو ٹالا نہیں جاتا ہم سے

یوں ہی اِس دشت میں بے کار چلے آئے ہیں
ہر قدم پاؤں کا چھالا نہیں جاتا ہم سے

نیند آنکھوں میں اگر آ کے ٹھہر بھی جائے
حُسن کو خواب میں ڈھالا نہیں جاتا ہم سے

یہ مرا شہر بھی آنکھوں میں سمٹ جائے نبیل
اُس کی یادوں کا حوالہ نہیں جاتا ہم سے

نبیل احمد نبیل

غزل

وداعِ ہجر ہے شامِ وصال باقی ہے
کہ زخمِ دل کا ابھی اندمال باقی ہے

ابھی تو دل کے دریچے میں روشنی کی ہے
ابھی تو شہرِ بدن میں دھمال باقی ہے

میں جس کا نام پکاروں وہ سامنے آ جائے
تمھیں یہ کر کے دکھانا کمال باقی ہے

سبھی نے رنگ لگائے ہوئے ہیں بستی میں
فقط تمہی پہ گرانا گلال باقی ہے

اگرچہ ایک زمانے کے بعد یاد آیا
خیال میں وہ شہِ خوش خصال باقی ہے

ابھی حیات ٹپکتی ہے ہر سخن سے ترے
تری غزل میں ترا ارتحال باقی ہے

سخن سے ربط بنایا ہے عابدی تو نے
ابھی عروج ملے گا زوال باقی ہے

علی حسین عابدی

غزل

چاہت کا رنگ رُوپ نکھارا نہ جا سکا
اُن کو نظر سے دِل میں اُتارا نہ جا سکا

مُدّت ہوئی کہ ہم سے جُدا ہو چکے ہو تم
دِل سے مگر خیال تمہارا نہ جا سکا

جاتے ہوئے خبر نہیں، کیا تُو نے کر دیا
اِک پل ترے بغیر گذارا نہ جا سکا

ملنے کی دیر تھی کہ بچھڑنا پڑا ہمیں
بارِ وفا کسی سے سہارا نہ جا سکا

کرنے کو یوں تو ہم نے بہت کچھ کیا مگر
بگڑا ہوا نصیب سنوارا نہ جا سکا

تبلیغ، وعظ، پند، نصیحت سے کیا حصول
خود کو ہی جب عمل پہ اُبھارا نہ جا سکا

بچپن کی ایک ایک خطا مجھ کو یاد ہے
ماں کے سوا کسی کو پکارا نہ جا سکا

اُس انجمن میں کیسے پہنچتے بذاتِ خود
جس انجمن میں ذِکر ہمارا نہ جا سکا

فیضانؔ میں تو حسن کا دِل جیتنے کو تھا
افسوس میرے عشق سے ہارا نہ جا سکا

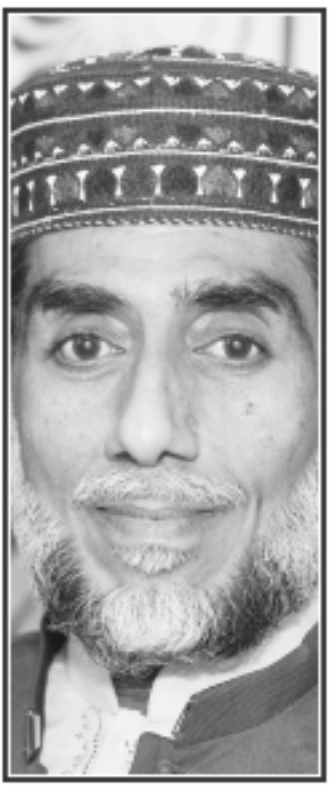

فیض رسول فیضان

غزل

درد کی تہہ سی کوئی دل پہ جمی رہتی ہے
آنکھ بھی جھیل ہے اور جھیل بھری رہتی ہے

اک محبت ہے جو سرشار کیے رکھتی ہے
اک مسافت ہے جو رستے میں کھڑی رہتی ہے

عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو بات کہی
کہہ چکے ہوتے ہیں پر ان کہی رہتی ہے

بھول جاتے ہیں مگر ایک ہی صورت برسوں
ہم نہ چاہیں بھی تو آنکھوں میں بسی رہتی ہے

میں تجھے اور یقیں کیسے دلاؤں فرح
تیری ہر یاد مرے ساتھ جڑی رہتی ہے

فرح شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

غزل

نہ پوچھ اے دوست تنہائی میں کیسے دن گزرتے ہیں
بہت بے کیف روز و شب ہیں ان میں رنگ بھرتے ہیں

نہ شوقِ بزم آرائی نہ کوئی حلقۂ یاراں
کوئی پوچھے تو کہہ دیتے ہیں اب ہم گھر میں رہتے ہیں

وہ کیا دن تھے کہ جی اُٹھتے تھے اس کو دیکھنے سے ہم
اور اب یہ حال ہے اپنا نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

یہ دل کا روگ ہے یا ہے کوئی آسیب کا سایہ
ہوا معلوم بلا آخر ''محبت'' اس کو کہتے ہیں

ہمیں ہر شام سورج بس یہی تو درس دیتا ہے
جو مغرب کی طرف جاتے ہیں اکثر ڈوب جاتے ہیں

یہ سچ ہے ناگہاں آفات کا یہ اک اشارہ ہے
اچانک اک جگہ سے جب پرندے کوچ کرتے ہیں

در دل پر یہ دستک دینے والا کون ہے اشفاق
ہم اپنے گھر میں جب ہوتے ہیں تو در کھول رکھتے ہیں

محمد اشفاق بیگ

غزل

جس نے بھی دستِ ظلم پہ بیعت نہیں ہے کی
پھر کوفیوں نے اسکی حمایت نہیں ہے کی

کل کی خبر نہیں جو تری یاد چھین لے
اب تک تو وقت نے یہ جسارت نہیں ہے کی

اہلِ زمیں تو ظلم میں مشہور تھے مگر
تو نے بھی چرخِ پیر عنایت نہیں ہے کی

سوچا تھا کچھ تو پاس کریں گے وفاؤں کا
لیکن کسی نے مجھ سے رعایت نہیں ہے کی

ہم کو بھنور میں چھوڑ کے ساحل سے جا لگے
ایسے خدا کی ہم نے عبادت نہیں ہے کی

جس سے معاشرے میں خلل تھا کسی نے بھی
اس شخص کی ذرا سی ملامت نہیں ہے کی

بدحال اس لیے ہے یہ امت رسول کی
جیسے کہا تھا ویسے اطاعت نہیں ہے کی

مجھ کو تمھارے غم نے بنایا ہے معتبر
کس کس نے آ کے میری زیارت نہیں ہے کی

جس میں تھا شک سزا کا ستمگر کو اے عطا
اس کیس کی کسی نے سماعت نہیں ہے کی

عطاالعزیز

غزل

نکل پڑا ہوں گھر سے میں وفاؤں کی تلاش میں
گھر سے کوئی نکل پڑے جیسے کہ فکرِ معاش میں

منصف کے سامنے کھڑا یہ سوچ کر خموش ہوں
پنہاں حیات و موت ہے قلم کے ارتعاش میں

اُس سے مِلا تو یہ ہُوا احساس دل میں بارہا
ہیں خوبیاں ہزار ہا اُس صاحبِ فراش میں

خونِ رگِ گلو بھی ہے شامل سُروں میں بے گماں
دنیا اُلجھ کے رہ گئی صدائے دل خراش میں

دیکھا بیاضِ دل تو یہ کہنا پڑا میری طرح
شامل ہے اُس کا نام بھی دنیا کے بدقماش میں

اُن کی گلی میں جا کے یہ مجھ پر کُھلا کہ آج بھی
ہیں مشکلیں ہزار ہا یہاں کی بود و باش میں

کرتا کسی پہ کس طرح میں اعتبار تُو بتا
میں ڈھونڈتا ہوں دوستوں کو دوستی کی لاش میں

بہتر ہے آپ ڈھونڈ لیں ورنہ تو جانتا ہوں میں
کرنے میں کس ہاتھ ہے رازِ دروں کے فاش میں

شکوہ کروں ندیم کیا میں جانتا ہوں کس طرح
''متاعِ چشم کھو گئی لباس کی تراش میں''

ریاض ندیم نیازی

غزل

دیوار رہ گزار اگر راستہ نہ دے
ڈر ہے مِرا جنون اِسے بھی گرا نہ دے

یہ جو ترے خیال میں گُم ہے ترا فقیر
انگلی پہ کائنات کو اِک دن گھما نہ دے

اِس واسطے ہوا سے میں کرتا نہیں کلام
یہ شوخ سارے شہر کو جا کر بتا نہ دے

اِک عمر میرا خواب تھا پانی ہو آس پاس
اب ڈر رہا ہوں مجھ کو یہ دریا بہا نہ دے

جو زخم دل پہ آیا تجھے دیکھنے کے بعد
آنکھوں سے کہہ دیا ہے کہ اِس کو ہوا نہ دے

سید تیمور کاظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آگ تاپی عجب ، عمر بھر ، بے طلب
جل بجھے ، اور اُٹھا دھواں بھی نہیں

غزل

ربطِ باہم نہ تھا سدا کے لئے — وہ تو شائستۂ وفا ہی نہ تھا
یاد ہم کو نہ آ خدا کے لئے — ہم بھی راضی رہے جفا کے لئے

شورشِ گردشِ زماں اور ہم — کیوں کسی کے لئے سُبک سَر ہوں
گنجِ تنہائی ہے بُکا کے لئے — کیوں جُھکائیں یہ سر دعا کے لئے

جنبشِ لب سُخن طراز نہیں — اپنے دامن میں بھر سکے انجم
اِک تمنائے نا رسا کے لئے — کوہ اِک چاہیے نِدا کے لئے

زیرِ مژگاں نہ اُٹھ سکے گی نگاہ
ہو گی رُسوا نہ التجا کے لئے

انجم عثمان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دین و دنیا کے میاں فاصل حدیں مٹتی گئیں
زندگی بنتی گئی ، جاں کا وبال اُس کے لیے

غزل

محبت کے قرینے سے اگر گفتار ہو جائے
خوشی سے آج میرا دل گل و گلزار ہو جائے

کروں باتیں میں اب تیرے در و دیوار سے ایسے
کہ جیسے درد میں کوئی مرا غم خوار ہو جائے

مرادوں کے کھلیں غنچے اگر دامانِ اُلفت میں
تو ہر آتش کدہ اس کے لیے گلزار ہو جائے

کسی کو بے وفا کہنا مناسب کب ہے اُلفت میں
خدا جانے وہ کب کس موڑ پر ناچار ہو جائے

حسیں کلیاں نثارِ جاں ہیں تیری مسکراہٹ پر
تو اک پل مسکرائے زندگی مہکار ہو جائے

اگر چہ ہے تمہاری دسترس میں یہ جہانِ دل
محبت سے توجہ، اے نگاہ یار! ہو جائے

تغیر آشنا ہے فطرت انسان دنیا میں
بہت ممکن ہے اب سارا جہاں بیدار ہو جائے

مرا تم نے تماشا جو بنایا ہے زمانے میں
خدا ایسا کرے، تجھ کو کسی سے پیار ہو جائے

عبدالرؤف زین

غزل

کاش ایسی سبیل ہو جائے
وصل کی شب طویل ہو جائے

سامنے جب بھی آ کے بیٹھے تو
سارا منظر جمیل ہو جائے

عشق کی آبرو رہے باقی
حسن ایسی دلیل ہو جائے

جس کو ہر وقت سوچتا ہوں میں
بس وہ میرا وکیل ہو جائے

سرد موسم طویل ہو گیا ہے
ہجر ہی کچھ قلیل ہو جائے

بس گزارش ہے میری اتنی سی
ساری دنیا عدیل ہو جائے

سب کے ثقلین کام آؤں میں
کوئی ایسی سبیل ہو جائے

ثقلین جعفری

غزل

لکھ لے اس بار سنا تو نہ زبانی مرے دوست
ہر گھڑی تیری بدلتی ہے کہانی مرے دوست

کیا دکھاؤں تجھے کس ڈھب کی محبت کی ہے
میں تو رکھتا ہی نہیں کوئی نشانی مرے دوست

مجھ سے تو پوچھتا کیا ہے کہ یوں ہوتا ہے کیوں
مجھ کو آتی ہے فقط ظرف فشانی مرے دوست

غیر کے چہرے پہ چہرہ نظر آتا جو نہیں
میں یقینی ہوں نہ اوروں پہ گمانی مرے دوست

چاہیے جاں تو دل و جان سے حاضر ہوں مگر
صرف رہنے دے مرے دکھ میں روانی مرے دوست

مات ہونے کو ہے دریاؤں کی طغیانی کو
اب کے وہ ہے مرے اشکوں کی روانی مرے دوست

وقت نے ہاتھ تو اب کھینچ لیا ہے عادل
خود ہی دل کو ہے مجھے آگ لگانی مرے دوست

عزیز عادل

غزل

بندھاتی ہے مری ڈھارس، وہ رکھتی ہے مجھے شاد
ہے اِک خوشی ابھی غم کے نواح میں آباد

کڑکتی دھوپ میں سَر پر تنی ہوئی چادر
یہ کوئی ابر کا ٹکڑا ہے یا تمہاری یاد

صدائیں آتی ہیں اُن بند کھڑکیوں سے ابھی
کرے گا کوئی نئے طرز پر جہاں ایجاد

خموشی محوِ تکلم ہے ، غور سے سُنیے
دبی ہوئی ہے کہیں بے نواؤں کی فریاد

یہ خواب اور ہے ،تعبیر سے ہے جو خالی
وہ خواب اور تھا جو دیکھتے رہے اجداد

کریں گے یاد تو ہوں گے وہ آبدیدہ بھی
جو کونوں کھدروں میں کرتے ہیں تذکرہ مرے بعد

عجیب نشۂ تخلیق میں ہوں غرق ظہورؔ
نہ جستجوئے پذیرائی ہے ، نہ خواہشِ داد

ظہور چوہان

غزل

ہم کہاں باز آنے والے تھے
تیرے تیور زمانے والے تھے

پاسِ حدِّ ادب روا رکھا
ورنہ دل کی سنانے والے تھے

ہم نے آنکھوں میں ڈال دی آنکھیں
ہم کہاں خوف کھانے والے تھے

تکتے رہتے ہیں آسماں کی طرف
وہ جو رستہ بتانے والے تھے

تو نے اچھا کیا رُلا ڈالا
ورنہ ہم مسکرانے والے تھے

ہم نے انٹیک میں شمار کیے
زخم جتنے پرانے والے تھے

قریۂ آرزو میں ہم اصغر
نام والے ، ٹھکانے والے تھے

اصغر علی بلوچ

غزل

تو نے ہمارے خواب چرائے اور ہمیں تردید کیا
ہم نے کتابِ دل لکھی تو عشق ترا تمہید کیا

جانے تیری مجبوری تھی یا تشکیک نے جال بنا
ہم نے بعید کو حال بنایا، تو نے حال بعید کیا

دنیا کے بازار میں آ کر سب کو کہاں ملتی ہے خوشی
لوگوں نے ارمان خریدے، ہم نے درد خرید کیا

اب کے برس بھی ہم نے تیری یاد سلائی سینے پر
اب کے برس بھی ہم نے تیرے ہجر سے وصل کشید کیا

تیری یاد نے آن لیا تو ٹوٹ کے روئے بارش میں
ہم نے ضبط سلامت رکھا، گریے کو تجرید کیا

اس نے بچھڑتے وقت کہی اک بات لرزتے ہونٹوں سے
نازشؔ! مجھ کو بھول نہ جانا، اس پر یہ تاکید کیا

شبیر نازش

غزل

ماہ تاب آنا تھا لیکن ماہ تاب آیا نہیں
اک سراب آنا تھا لیکن وہ سراب آیا نہیں

ہم نے پہلے خواب کی دیکھی نہیں تعبیر جب
خواب اور آنا تھا لیکن اور خواب آیا نہیں

ہم تو اپنے بچپنے سے ہی بڑھاپے میں گئے
اک شباب آنا تھا لیکن وہ شباب آیا نہیں

سر ہتھیلی پر لیے کچھ لوگ نکلے تھے مگر
انقلاب آنا تھا لیکن انقلاب آیا نہیں

پیار ان کی بے وفائی کے سبب آیا ہے کم
بے حساب آنا تھا لیکن بے حساب آیا نہیں

محمد ادریس قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اِک شہر تھا ، اِس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

حَسین ہوں گے بہت آپ سا کدھر کوئی ہے
ہمیں دکھائی تو دے شہر میں اگر کوئی ہے

تمہارے جیسی تو صورت نہیں بنائی گئی
ہمارے جیسی بھی کہہ دو اگر نظر کوئی ہے

اب ایسا وقت ہے جس میں کوئی کسی کا نہیں
ہمارے واسطے لاہور میں مگر کوئی ہے

کسی کا ڈھونڈنا تنہائی اتنے لوگوں میں
کسی کا چیخ کے کہنا وہ اپنے گھر، کوئی ہے؟

کچھ ایسا قحط پڑا ہے جہاں میں پھولوں کا
کسی بیاض میں رخ پر نہ شاخ پر کوئی ہے

گھروں میں اور مکانوں میں فرق ہوتا ہے
اسے مکان ہی کہیے میاں، یہ گھر کوئی ہے

نہ جانے ایسے تعلق کا کیا بنے گا دوست
اسے ہے خوف کسی کا نہ مجھ کو ڈر کوئی ہے

عجیب صورتِ احوال ہے کہ اب انجم
تمام دن کوئی نئیں اور رات بھر کوئی ہے

امتیاز انجم

غزل

آج ہم ایک تازہ ہیر لکھتے ہیں
پیار کا درس غالب میر لکھتے ہیں

بات دل کی سجن سے کرتے کیسے ہم
ڈائری میں ہی اک تحریر لکھتے ہیں

ہم نہیں جانتے کوئی ہنر ایسا
لوگ معصوم ہیں وہ پیر لکھتے ہیں

اتنا معلوم ہے پر آج تک ہم کو
پیار کے معنی تو دلگیر لکھتے ہیں

اک ہے انداز ان کا ہائے سب عاشق
اس کو اپنی یہاں تقدیر لکھتے ہیں

محمد کلیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ دیکھ لیں نہ مرے عجز کی اُٹھان کہیں
لگا نہ دیں غمِ نو سال پر لگان کہیں

غزل

پرانے عہد نامے گر افق پر نقش ہو جاتے
مقدس ابر پارے اس زمیں کے زخم دھو جاتے

اگر اک سورمارن میں سویرے سر نہ دے جاتا
کئی بے نام پیادے شام کی گھاٹی میں کھو جاتے

حویلی سے طلسمی بانسری کی لے ندا دیتی
کہانی کہتے کہتے قصہ گو ڈیوڑھی میں سو جاتے

سلگتی تھی محلے میں نحوست کی اگربتی
فرشتے پھر یہاں عُودِ سعادت کیسے بو جاتے

اگر آشفتگی کی آنچ سے دیدے نہ جل اٹھتے
پری زادوں کے پاؤں آنسوؤں سے ہم بھگو جاتے

چھلکتی ہوں گی آوازیں سماعت کے پیالوں سے
کبھی سوچا کہ اس منظر کو آنکھوں میں ڈبو جاتے؟

عقوبت گاہِ دنیا سے چلے جب تو خیال آیا
خموشی کے بدن میں اپنی چیخیں ہی چبھو جاتے

ازل سے تھا یہی معمول بوڑھے دیوتاؤں کا
تھکن سے صبح دم بستر پہ گرتے اور سو جاتے

عابد رضا

غزل

جب سے تمھارے نام کا قُرعہ نِکل پڑا
آرائشِ خیال کا رستہ نِکل پڑا

پھر سے ترے خیال کی خُوشبو اٹھی تو ہے
پھر سے تعلقات کا زِینہ نِکل پڑا

پہلے تو خوشبوؤں کے کئی رنگ ساتھ تھے
پھر یُوں ہُوا کہ ہِجر کا صحرا نِکل پڑا

اب گُل رُخی کے بعد ستارہ رُخی بھی ہے
اور تُجھ سے گُفتگو کا قرینہ نِکل پڑا

میں وقت کے حصار کو تو مانتی نہ تھی
تجھ سے جدائیوں کا مہینہ نِکل پڑا

عظمیٰ نقوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

موسم پسِ دیوارِ مہ و سال نہ بدلا
خالد! وہی آنکھیں، وہی کاندھا، وہی سر ہے

غزل

منصف نے کہہ کے روک دیا درمیان سے
شب کی ہتک ہوئی ہے دیے کے بیان سے

نکلی ہے کیسی رو میں کنارِ چٹان سے
دریا کا ہے گمان ندی کی اٹھان سے

ورنہ تو اک قدم کی مسافت تھی اور بس
ٹکرا کے رہ گیا میں انا کی چٹان سے

تیور بدلتے دیکھ کے مت خوش گمان ہو
بدلے گا فیصلہ نہ تمھارے بیان سے!

کیا فیصلہ ہے ہم کو پتہ ہے، مگر کہو
کچھ اور لطف ہوگا تمھاری زبان سے

انکار میں بھی لذتِ اقرار گھولتا
وہ شخص بولتا ہے بہت ہی رسان سے

گرچہ شکار تیر کی حد میں پہنچ گیا
کچھ اور دیکھتا ہے شکاری مچان سے

میرے چراغ جیتیں کہ ہاریں اے شب زدو
میں متفق نہیں ہوں تمھارے گمان سے

کیا سوچنا کہ کوئی نشانے پہ تھا نہیں
اب تیر تو نکل ہی چکا ہے کمان سے

کچھ لوگ انتظار کے ملبے میں دب گئے
اب کیا تلاشتے ہو پرانے مکان سے

بازارِ زندگی بھی عجب ہی فریب ہے
ہم کیا اٹھا کے لائے ہیں جانے دکان سے

مٹی کا اک چراغ ہے سورج نہیں کوئی
لرزہ ہے شب پہ کس لئے لَو کی اٹھان سے

کہنے کو تھی مہین سی تشکیک کی لکیر
ہم کٹ کے رہ گئے ہیں مگر درمیان سے

محمد نور آسی

غزل

موجود جو بستی میں نہیں یار ہمارا
اب پیڑ نہیں کوئی ثمربار ہمارا

ہم لوگ محبت کی زباں بول رہے تھے
تاریخ بتائے گی یہ کردار ہمارا

ہم روز ہٹاتے ہیں یہ تقدیر کا پتھر
ہوتا نہیں رستہ کبھی ہموار ہمارا

کچھ عکس جو حیرت سے ہمیں دیکھ رہے ہیں
کردیں نہ کہیں آئنہ زنگار ہمارا

اب آنکھ میں خوابوں کی ستائش نہیں ہوتی
لگتا ہی نہیں یار یہ دربار ہمارا

اس عشقِ بلا نوش نے بخشا ہے کسی کو؟
اب رند ہے وہ صاحبِ دستار ہمارا

ہم لوگ نہیں قائلِ تقسیمِ محبت
جب یار ہمارا ہے تو بس یار ہمارا

انصر منیر

غزل

ہمارا ذکر کہاں تھا ترے فسانے میں
جو ہو سکے تو بھلا دو وہ تلخیاں تم بھی

نجانے کیسے ہوئے معتبر زمانے میں
نہیں ہے فائدہ کچھ نفرتیں بڑھانے میں

سمجھ رہے تھے کہ مشکل ہے بھولنا تیرا
تمہاری ضد ہے مگر تم گرا نہ پاؤ گے

لگی نہ دیر مگر تجھ کو بھول جانے میں
گرے ہیں لوگ بہت اک ہمیں گرانے میں

سمجھ سکے نہ تمہیں اور نہ کی کبھی کوشش
پلٹ بھی آئیں جو پھر کیا، بدل چکا ہے سب

تھا سارا دوش ہمارا تمھیں گنوانے میں
تھی مصلحت بھی یہی فاصلہ بڑھانے میں

جدا ہو سوچ تو رشتہ نبھانا مشکل ہے
کبھی کبھی خوشی ہوتی ہے دور جانے میں

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جمع کرتے رہ گئے مال و منال اُس کے لیے
ہم کہ اِک دُکھ بھی نہ رکھ پائے بحال اُس کے لیے

غزل

حالات نے ذرا بھی سنورنے نہیں دیا
کوئی بھی کام ڈھنگ سے کرنے نہیں دیا

محفوظ ہیں نگاہ میں اب بھی اُسی طرح
چاہت کا کوئی لمحہ بکھرنے نہیں دیا

افلاس کے عمیق سمندر نے دوستو
مجھ کو ڈبویا یوں کہ ابھرنے نہیں دیا

رکھتا ہوں طیش میں بھی مقابل کی آبرو
خود کو کبھی بھی حد سے گزرنے نہیں دیا

کچھ عزم ہیں خیالی ادھورے پڑے ہوئے
مجھ کو اِسی خیال نے مرنے نہیں دیا

زبیر خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آج خالد ہمیں کاش جینے ہی دیں
چوکھٹوں میں جو کل ہم کو جڑ جائیں گے

غزلیں

کوزہ گرانِ زندگی میرا زوال دیکھیے
اپنوں کے درمیاں مجھے ہوتا نڈھال دیکھیے

صبحِ ابد کو دیکھنے جانا ہے آپ نے اگر
شامِ ازل میں غور سے تاروں کی چال دیکھیے

رقصاں رہی محبتیں ان پر بڑی ہی شان سے
بکھرے ہیں رنگ کس طرح دونوں کے گال دیکھیے

میرا مقابلہ اگر کرنا ہے آپ کو حضور
میری مثال سوچیے ، میری مثال دیکھیے

خیمہ گہِ حیات میں آ کر بہ عوضِ روشنی
میرے بدن پہ اگ رہی کیکر کی چھال دیکھیے

کرنا پڑا ہے شوق کی منزل سے آگے کا سفر
آئے ہیں آج لوٹ کے چہروں کا حال دیکھیے

اپنے بدن کے ساتھ ہی رستے میں ہوں پڑی ہوئی
میرے بدن پہ خاک کی بوسیدہ شال دیکھیے

رخسانہ سمن

خیرہ سرانِ زندگی کیسا کمال کر لیا
روئے بغیر آپ نے آنکھوں کو لال کر لیا

تیرہ شبوں نے مانگی تھی ہم سے مثال آپ کی
سورج کو ہم نے آپ کی تازہ مثال کر لیا

کتنی عجیب بات ہے تم نے بہ عوضِ چشمِ تر
حیرت سرائے شوق میں خود کو نڈھال کر لیا

راہِ حیات پر مرے بھٹکیں گے کس طرح قدم
میں نے تمہاری چال کو تاروں کی چال کر لیا

جس نے ہماری آنکھ کو چشمِ سخن بنایا تھا
ہم نے اسی کے شوق میں جینا محال کر لیا

تیرے خیال سے ہمیں راحت ملی ہے، یعنی اب
رستہ حیات کا سمن ہم نے بحال کر لیا

غزل

حواس و ہوش چلے جائیں تو خبر بھی نہ ہو
یہ کیا کہ حسن کا اعجاز اس قدر بھی نہ ہو

یہ کیا کہ لکھتا رہے داستان عشق سدا
یہ کیا کہ آپ جنوں خیز دربدر بھی نہ ہو

یہی ہے خواب کہ دریا کے پار کھیتوں میں
اکیلے دوڑتے جائیں تو یاد گھر بھی نہ ہو

یہ کیا کہ جھیل کنارے اداس صدیوں تک
بس اک صدا ہو مدھر اور کوئی ڈر بھی نہ ہو

یہ کیا کہ صحن چمن میں ہو خوبصورت گھر
نواح میں مگر آباد اک بشر بھی نہ ہو

یہ کیا کہ بانس کی فریاد پر سلگتے ہوئے
ہم ایک تان لگائیں تو بے اثر بھی نہ ہو

یہ کیا کہ دوست بچھڑ کر خفا خفا نہ رہیں
یہ کیا کہ آگ لگی ہو تو اک شرر بھی نہ ہو

یہ کیا کہ مرد کے شایان اشک غم بھی نہیں
یہ کیا کہ ہجر مسلسل میں چشم تر بھی نہ ہو

یہ کیا کہ عفو بھی درویش کی دعا میں رہے
یہ کیا کہ راہ سلوک اور مختصر بھی نہ ہو

اورنگزیب حسام حر

غزل

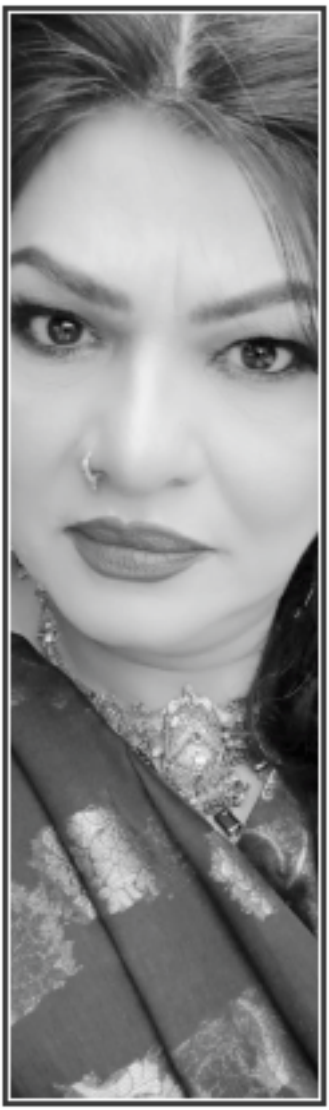

اس کی شیرینیٔ زباں کی بات
سب نہیں زیبِ داستاں کی بات

پیار میں سود اور زیاں کی بات
جڑ رہے ہو کہاں ، کہاں کی بات

میرے بارے بھی کچھ کرو ارشاد
سن چکی ہوں فلاں فلاں کی بات

دل بھی اک کام چور بچہ ہے
سن کے گھبرائے امتحاں کی بات

شاید آئندگاں تلک پہنچے
بن کے افسانہ رفتگاں کی بات

سب حقیقت بنا کے پوچھتے ہیں
اور ہوتی ہے بس گماں کی بات

حجرۂ ذات کا اسیر کوئی
چھیڑ بیٹھا ہے لامکاں کی بات

بھر گئی ہے مجھے منافعوں سے
ظاہراً سعیِ رائگاں کی بات

شعر میں ہی سمیٹ لی ہے جیا
عشق سے بحرِ بیکراں کی بات

جیا قریشی

غزل

ایک دیدار کا تماشا ہے
ہر طرف یار کا تماشا ہے

صحنِ جاں میں عجیب بھیڑ سی ہے
جیت اور ہار کا تماشا ہے

کیا منافع ہے، اور خسارہ کیا!
در و دیوار کا تماشا ہے

ہر گھڑی انتظار سی صورت
یہ بھی اقرار کا تماشا ہے

یہ جو دل میں چبھن سی ہے کوئی
آر کا، پار کا تماشا ہے

رفتہ رفتہ قریب آتے گئے
پیار، اظہار کا تماشا ہے

یہ جو ہر لحظہ آنکھ نم ہے حنا
دلِ بیدار کا تماشا ہے

حنا بابر چوہدری

غزل

آسماں سے ترے، اتارے ہوئے
ہم ہیں اپنی تھکن کے مارے ہوئے

اگلی صف میں ہمیں جگہ تو دے
ہم بھی دیکھیں کہاں خسارے ہوئے

اک نظر، اک بدن، اور ایک کتاب
زندہ رہنے کے استعارے ہوئے

روشنی اس طرف نہیں آتی
تیرگی کے تو وارے نیارے ہوئے

رنج و غم میں بھی ہو گئی تقسیم
کچھ ہمارے تو کچھ تمھارے ہوئے

میں نے تو ایک جھوٹ بولا تھا
کیوں زمانے خفا یہ سارے ہوئے

شور برپا تھا اور اسی گھر میں
کان بہرے مگر ہمارے ہوئے

میں بھی کہہ سکتا ہوں غزل اک اور
کون سے رنگ سب تمھارے ہوئے

جابجا پھر رہے ہیں گلیوں میں
ایک آہٹ پہ جان وارے ہوئے

یعنی اب میں کہیں کا ہوں ہی نہیں
فیصلے یوں بھی میرے بارے ہوئے

یہ جو تنہا ہیں اور چپ چپ ہیں
اول اول فقط ہمارے ہوئے

تیرگی سے اگر شکائتیں ہیں
چاند تارے کہاں ہمارے ہوئے

میں تھا غالب تھا اور یگانہ بھی
رات باہم کئی اشارے ہوئے

تم نے پوچھا نہ رُک کے جاتے ہوئے
زندگی میں کہاں خسارے ہوئے

کون کس موڑ پر بچھڑ جائے
یاد آتے ہیں دن گزارے ہوئے

میں بھی کھڑکی سے دیکھ آیا ہوں
زندہ لوگوں میں جو اشارے ہوئے

آپ چاہیں تو شوق سے آئیں
مندمل زخم سب ہمارے ہوئے

ٹیڑھے میڑھے یہ راستے بھی نوید
زندگانی کے گوشوارے ہوئے

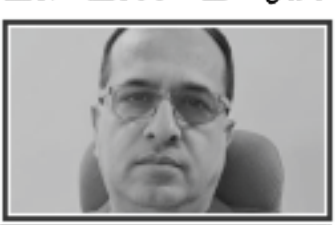

نوید صادق

غزل

کنور امتیاز احمد

کہہ رہی ہے میری پیشانی مجھے
ہے اِسی مشکل میں آسانی مجھے

دشت میں کچھ اور بھی ہوگا مگر
روکتی ہے اِس کی ویرانی مجھے

اُس طرف، کچھ اِس طرف، کچھ اُس طرف
راس آئی ہے پریشانی مجھے

مجھ کو لے بیٹھا مرا رونے کا شوق
راستہ دیتا نہیں پانی مجھے

جب سے ہوں میں اُس کے کہنے میں کنور
ڈھونڈتی ہے میری من مانی مجھے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر مجھ کو چراغوں نے ٹھہرنے نہ دیا
میں وہ لَو تھا جسے سورج نے اُبھرنے نہ دیا

پنجاب کے گمشدہ کردار دھوبی چٹا میلا [خاکہ]

دھوبی چٹا میلا کا اصلی نام مجید ہے اور تمام لوگوں میں وہ مجید بھائی کے نام سے مشہور ہے، آج تک کسی نے اس کو صرف مجید کہا اور نہ ہی کسی نے کبھی مجید صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔

اس لیے یہ ہر چھوٹے بڑے مرد عورت کے لیے مجید بھائی ہی رہا کبھی اس کو چڑانے کے لیے کوئی پوچھ لے کے مجید بھائی آپ کی بیگم بھی آپ کو مجید بھائی کہتی ہیں، تو مجید بھائی کہنے والے کو پہلے غور سے دیکھتا ہے پھر کہتا ہے۔ پتر مری بیگم تھتھی ہے اور وہ جب مجھے بلاتی ہے تو کہتی

ما۔ ما۔ ماما مجید یوں وہ مجھے بھائی نہیں ماما کہتی ہے پر پتر توں دس توں بڈھی نوں کس نام تو بلاناا ے ہئی، یار کیا مٹھا نام اے

پھر اپنے منہ میں انگلی ڈال کر یوں چوستے ہوئے باہر نکالتا ہے کے دیکھنے والے کو ہنسی آجاتی ہے مگر یہ سنجیدہ ہی رہتا ہے پر مخاطب ذرا تلخ لہجے میں بات کرے تو یہ کہتا ہے۔ گل سن توں بڑی میلی گل کیتی اے، میں تے اس نوں سوڈا کاسٹک لا کے چٹا کیتا ہے دس میرا کی قصور اے۔

باتوں کو چٹا میلا کہنا کپڑوں کو چٹا میلا کہنا مجید بھائی کی عادت ہے اسی لیے بہت بے تکلف قریبی لوگ اُسے چٹا میلا کے نام سے بھی مخاطب کرتے ہیں مگر وہ اس کا برا نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ ساری زندگی لوگوں کے کپڑے دھوئے ہیں میل کچیل صاف کی ہے تو چٹا میلا نام تو بنتا ہے۔

مجید بھائی کا کہنا ہے کہ میں اپنے دھوبی گھاٹ پر کام کرنے والے گروہ کا سرغنہ تھا۔ کوئی اس کی اصلاح کرے کہ سرغنہ نہیں سربراہ ہوتا ہے تو یہ بڑے نازو انداز سے ہاتھ گھما کر کہتا ہے کہ نانا نا، یار سرغنہ ہی ٹھیک ہے۔ سربراہ تو غداری کر جاتا ہے، مگر سرغنہ غداری نہیں کرتا،

یہ کہہ کر وہ ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے اور کہتا ہے، کیوں فیر ہوئی ناں بولتی بند پتر ہمارے پاس علم ہے۔ ہم دھوبی ہیں دھوبی۔ کوئی پروفیسر نہیں ہیں۔

اعجاز رضوی

مجید بھائی کا قد لمبا اور جسم دبلا پتلا ہے۔ کپڑے پھنچ پھنچ کر گردن اور کمر میں ذرا سا خم آ گیا ہے جو چلتے وقت بڑا نمایاں لگتا ہے۔ یہ رنگین کرتا اور دھاری دھار دھوتی پہنتا ہے پاؤں میں قینچی چپل اور گردن میں پرنا رکھتا ہے قد لمبا ہونے کی وجہ سے اس کی دھوتی ذرا اٹھی ہوئی رہتی ہے اور اس طرح اس کی کالی پنڈلیاں صاف نظر آتی ہیں یہ چلتے ہوئے، اپنے ہاتھوں سے کرتے کا دامن یوں بار بار صاف کرتا ہے جیسے اس پر کچھ لگ گیا ہو، یہ دھوبی گھاٹ سے کچھ دور اپنے ایک کام چھوڑ عزیز کی لانڈری کی دکان پر آتا ہے، تو گئے دنوں کو یاد کرتا ہے، پتر وہ کا سٹک سوڈے سے دھولا ہوا چٹا زمانہ اب نہیں آنا۔ ہائے ہائے کیا زمانہ تھا کہہ وہ خاموش ہو جاتا۔ سامنے والا کچھ انتظار کے بعد کہتا ہے مجید بھائی بولو، تو کیسا زمانہ تھا، تو وہ بڑے انداز کے ساتھ کہتا ہے مفت بتا دوں چل چائے شائے کا آرڈر دے یوں چائے آنے پر پورے کپ کو مٹھی میں پکڑ کر چسکی لیتا ہے اور کہتا ہے، اس زمانے میں بجلی کے استعمال کا طریقہ تک نہیں آتا تھا۔ کوئلوں والی استری ہوتی تھی پھر گیس والی آ گئی، مگر جو مزا کوئلوں کی استری کا تھا وہ کسی خوبصورت جوان جان دار استری میں بھی نہیں تھا، یہ کہہ کر ہنسنے لگتا اور پھر کہتا یہ ایک الگ سٹوری ہے۔ نالے بالغان کے لیے ہے۔

چٹا میلا کو یاد ہے جب وہ اپنے باپ دادا کے ساتھ صبح سویرے دھوبی گھاٹ جایا کرتا تھا تو گھر سے چلتے ہوئے ایک گدھا اور ایک کتا بھی ساتھ ہوتا تھا۔ کتا گھر سے نکلتے ہی خوشی سے اِدھر اُدھر یوں بھاگتا جیسے اسے آزادی مل گئی ہو پتر میں بھی اپنے کتے کے ساتھ ساتھ بھاگتا اور جب دھوبی گھاٹ آ جاتا تو میرے باپ دادا اور بہت سے رشتہ دار بھٹی میں آگ جلاتے اور میلے کپڑوں کو طے لگا کر گرم پانی میں رکھ دیتے۔ پتر ہم دھوبی لوگوں میں اسے بھٹی کی مار دینا کہتے ہیں، جب تک یہ کام ہوتا، کوئی نوجوان الگ سے چھوٹے چولہے پر چائے بنا لاتا، سب چائے پیتے اگر کسی کے پاس کوئی باسی روٹی ٹکر ہوتا تو وہ چائے کے ساتھ کھا لیتا، پھر لوگ جانکیہ بنیان یا دھوتی کس کر پانی والی کھرلی پر آ جاتے، ایک بندہ بھٹی کی مار کھائے کپڑوں کو بار باری کھرلی پر رکھتا ایک قریبی کھو سے یا نلکے سے پانی لاتا اور کھرلی کو بھر دیتا، ویسے یہ بات کافی پرانی، بلکہ کافی پاٹی پرانی ہے میرے زمانے تک تو ٹیوب ویل آ گئے تھے، جس کو ہمی بھی کہتے تھے پانی کی فراوانی تھی کھرلی جس کو حوض بھی کہتے ہیں اس میں رہنا اچھا لگتا ہے، مگر سردیوں میں کافی مشکل ہو جاتا تھا۔ پر مجبوری تھی رزگار تھا ویسے میں یہ بتا دوں دھوبی کوئی ذات نہیں ہے یہ ایک پیشہ ہے

ایک کام ہے اور وہ بھی انگریزوں کا بنایا ہوا انگریز نے اپنے زمانے تک فوجی علاقوں میں جس کو اب کینٹ ایریا کہتے ہیں کافی دھوبی گھاٹ بنوائے، اور ہم کالوں کو یہ کام سونپا تھا کہ ہم اُن عالی جناب کے میلے کپڑے اور وردیاں دھوئیں اور استری کریں، پتر جی، اگر اس زمانے میں کسی کو مار پڑتی تھی، تو لوگ سمجھ جاتے تھے کہ یہ دھوبی ہے اور کپڑے نہ دھونے یا داغ دھبے ہونے پر انگریز سرکار سزا دے رہی ہے اس زمانے میں انگریز نے کھلی کھلی جگہ پر بہت سے دھوبی گھاٹ بنائے تھے پھر اپنے کالے انگریزوں نے بھی ہمیں غلام ہی رکھا، اور ہم آج تک اُن کے میلے کپڑے دھو رہے ہیں یہ کہہ کر مجید بھائی کچھ اُداس ہو گیا اور کافی دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اچانک کسی نے کہہ دیا، مجید بھائی یہ تو ہمارا کلچر ہے یہ بات سن کر مجید چنا میلا لال پیلا ہو گیا اور غصہ سے بولا، میں گال کڈنی سی، پر برداشت کر گیا۔

سن اُوے وڈے کلچر دے پترا، میں لعنت بھیجتا ہوں اس کلچر پر، یہ کلچر ہے کہ ایک بندہ کاسٹک سوڈے اور بلیچ سے ہاتھ پاؤں زخمی کر لے، پھر میلے کپڑوں کو کھولی کی کردری پٹڑی پر زور زور سے پٹخے۔ پُتر اس کپڑے پٹخنے کو تیرے جیسے شہری بابو دھوبی پٹیرا کہتے ہیں کپڑے پٹختے ہوئے ہمارے منہ سے ایک مخصوص آواز نکلتی ہے جس کا ترجمہ کرنے والا کہتا ہے کہ یہ اللہ ہو کہہ رہا ہے پُتر جی یہ اللہ ہو نہیں ہمارے دکھوں کی جھنکار ہے ہمارے مسائل کی پکار ہے سن اُوے کلچر دے ڈیڈی جان، ہمیں ان تکلیفوں کے بعد پہلے 5 پیسے فی کپڑا اجرت ملتی تھی، پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ اجرت بڑھی 50,40,30,25,20 روپے کے بعد اب ہمیں فی جوڑا- 180 روپے یا 200 ملتے ہیں۔

پتر دھوپ ہو یا ٹھنڈی ہوا، آگ برسے یا بارش ہو ہم نے تو گھاٹ پے جانا ہی جانا ہے ہمارے دھوبی گھاٹ پر آنے جانے کو ایک صورت دینے کے لیے کسی سرکاری درباری عقل مند نے یہ محارہ بنایا تھا کہ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔

ویسے پتر یہاں پر کتے کے ساتھ ہمیں بھی شامل کر لینا کے کتے کو کیا پتہ کے لوگ مجھے کہہ رہے ہیں دراصل ہم ہی وہ کتے ہیں جو گھر کے ہیں نا گھاٹ کے ہم عوام ہیں عوام پھر رونی سی آواز کے ساتھ بولا: ہم لاوارث ہیں لاوارث

یہ کہہ کر دھوبی چنا میلا کا صبر برداشت جواب دے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اُسے روتا دیکھ کر پہلے تو سب لوگ پریشان ہو گئے اور اُسے تسلی دینے لگے، چنا میلا نے آنسو صاف کرنے کے لیے اپنا کرتا اوپر اُٹھایا تو ایک من چلے نے اس کے پیٹ پر ہاتھ مار دیا، یوں سنجیدہ مجید بھائی چنا میلا

یکدم اپنے مزاج کے مطابق کھلکھلا کر ہنسنے لگا، پھر ہنستے ہنستے بولا، آج تو تم لوگوں نے مجھے دھوڈالا رب سوہنے دی قسم زندگی میں کبھی کبھی ایسا دن چڑھتا ہے کہ بندہ پورا کا پورا کا سنک سوڈے کے ساتھ ڈھل جاتا ہے، اور چٹا ہو کر نکلتا ہے، اس وقت میلا کدھر جاتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

مجید بھائی کا کہنا ہے کہ مسجدوں کی طرح پہلے شہر کے تین میل میں تقریباً لمبائی میں دو دھوبی گھاٹ ہوتے تھے، دھوبی گھر سے کپڑے وصول کرتا تھا، پھر اُنھیں پانچ چھ دن کے وعدے پر واپس بھی کرتا تھا۔ کپڑوں کی گنتی یوں ہوتی تھی چار، چھوٹے تین بڑے، پانچ زنانے دو بنیان ایک نیکر۔ ایک چھوٹی نیکر کپڑوں کی شناخت کے لیے کچھ نشان کچھ کوڈ ورڈ ہوتے تھے۔ اس سے کپڑوں کا پتہ چلتا تھا کے کس گھر کے کپڑوں میں اس خفیہ نشان کو صرف دھوبی ہی جانتا تھا۔ غلطی سے کپڑے بدل جائیں یا کپڑے میں کسی اور کا رنگ چڑھ جائے تو دن رات معافی بھی مانگنی پڑتی تھی۔ اس لیے میں نے تو بقلم خود اپنے زمانے میں کافی ساری معافی اپنے ویڑے کے ہارسوٹا چھوڑی تھی۔ بک بھر بھر کے سارا دن معافی نامہ لوگوں میں تقسیم کرتا تھا کان پکڑتا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ اس معافی کے سوا اور کوئی چارا بھی نہیں تھا کہ انگریزوں سے کہیں زیادہ اپنے کالے انگریز غصے والے ہیں۔ رب سوہنے نے ان سے بچانے کے لیے ہی واشنگ مشن ایجاد کی ہے کہ اب گھر گھر دھوبی گھاٹ کھل گیا ہے۔ غریب عورتیں گھروں میں کپڑے دھوتی ہیں۔ اور معمولی سے معمولی خاتون بھی بیگم صاحبہ بن گئی ہے اور میرے جیسے مجید بھائی زمانے درزمانے سے چٹے میلے ہی چلے آ رہے ہیں مگر..... پھر مجید بھائی کچھ سوچ کر اِدھر اُدھر دیکھ کر، آنکھوں میں آیا اشک روک کر بولا، پتر ہمیں محنت کا پھل مل گیا ہے کہ پہلے ہم گدھے اور کتے رکھتے تھے اور اب گدھے اور کتے نے ہمیں رکھا ہوا ہے کہ سارے دھوبی گھاٹ، سیاسی باؤ لوگوں نے اپنے قبضے میں کر لیے ہیں گھر دکانیں اور پلازے بنا لیے ہیں اور ہمارے وہ دھوبی گھاٹ اب ایک سیاسی گھات میں بدل گئے ہیں۔ اسی لیے ہمارے بچے اب دھوبی کا کام کرنے کے بجائے کچھ اور کام کر رہے ہیں کسی نے لانڈری کھول لی ہے کوئی بس استری کرتا ہے کوئی مکینک بن گیا ہے تو کوئی ڈرائیور مگر یہ مجید بھائی چٹا میلا دھوبی کا دھوبی ہی رہا، ابھی وہ حالات نہیں بنے کہ جب لوگ مجھے بھی مجید صاحب کہہ سکیں اور میں فخر سے کہہ سکوں گا کہ ہاں میں مجید چٹا میلا نہیں بلکہ آپ سب جیسا ہی زندہ عبدالمجید صاحب ہوں اور ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہوں جن کو آپ پنجاب کے گمشدہ کردار کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اُف کی ڈائریاں [طنز و مزاح]

الحمدللہ مجھے ابا جی کی کلیات مرتب کرنے کا موقع ملا۔ جو یقیناً میرے لیے باعث اعزاز ہے۔ اس تاریخ ساز موقعے پر میں ابا جی کی رنگ برنگی، چھیل چھبیلی نخریلی اور نوجوان ڈائریوں کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ کیونکہ قدم قدم پر میرا واسطہ ان سے پڑتا رہا ہے اور مثل مشہور ہے کہ:

راہ پیا جانڑے تے واہ پیا جانڑے

تو جو کچھ ان ڈائریوں نے میرے ساتھ سلوک کیا۔ وہی سپرد قلم کرنا چاہتی ہوں۔

یہ ڈائریاں --- یہ نیلی پیلی کالی ڈائریاں

ابا جی میں پروفیسرانہ اور تخلیق کارانہ صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ پروفیسرانہ اس لیے نہیں لکھا کہ یہ ان کا شعبہ رہا ہے بلکہ اس لیے لکھا کہ جو چیز جہاں رکھتے ہیں، وہیں بھول جاتے ہیں اور جو چیز سب سے زیادہ بھولی جاتی ہیں، وہ یہی عزت مآب ڈائریاں ہیں۔ علاوہ ازیں تخلیق کارانہ اس لیے لکھا کہ کمرے میں چیزیں بے ترتیب انداز میں رکھی جاتی ہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی ڈائریوں کی گمشدگی کی، کہ کس کس طرح ان کی گمشدگی میرے قلب نازک پر تیر برساتی رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری کبھی کوئی چیز گمی نہیں اور ابا جی کی کوئی چیز کبھی ملی نہیں۔ جن میں موبائل، اخبار، کتابیں اور یہ ڈائریاں سرفہرست ہیں۔

کلیات کے سلسلے میں ابا جی کی شدید خواہش تھی کہ کلام کا کوئی بھی حصہ ایسا نہ ہو جو کلیات میں شمولیت حاصل نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں ابا جی کے حافظے کی داد تو دینی پڑے گی کہ خوب یاد رہتا تھا کہ فلاں کلام لال ڈائری میں ہے، لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کونسی لال ڈائری؟ کیونکہ پچاسیوں لال ڈائریاں موجود تھیں۔ یہ معلوم کرنے کی خطرناک ذمہ داری میرے نازک کاندھوں پر ڈال دی جاتی تھی۔ اب سفر شروع ہوتا تھا اس لال ڈائری کو ڈھونڈنے کا، اس ڈائری کے علاوہ تمام چھوٹی، بڑی، اونچی، لمبی، لال ڈائریاں حاضر خدمت کی جاتی رہیں، لیکن وہ لال ڈائری گمشدگی کا لبادہ اوڑھے چپ چاپ پاس ہی کہیں پڑی رہتی۔

میں جو لال ڈائری تلاش کرتے کرتے تھک چکی ہوتی، ابا جی کے حضور آداب عرض کرتی اور کہتی کہ ابا جی رہنے دیں اگر وہ کلام شامل نہ بھی ہوا، تو کیا حرج ہے؟

اس پر ابا جی فوراً آواز بلند ارشاد فرماتے:

''توں ویسے اج تک میرا کوئی کم کیتا اے؟ نئی ناں --- فیر اے وی رہن دے۔ میں کسے ہور نوں کہہ دیندا واں''۔

عین اسی لمحے گھر کے دوسرے حصوں سے مبارک سلامت کی آوازیں آنے لگتیں کہ مبارک

سیدہ آمنہ ریاض

ہو ڈائری مل گئی ہے اور اباجی کا چہرہ یوں کھل اٹھتا گویا انتیسویں رمضان کا چاند نظر آ گیا ہو۔

جس سے فوری میں نے حساب کا کلیہ اخذ کیا کہ:

اباجی کا موڈ اچھا ہونا از ڈائریکٹلی پروپوشنل ٹو ڈائری کا ملنا اور اباجی کا موڈ خراب ہونا از انورسلی پروپوشنل ٹو ڈائری کا گمنا۔

اباجی کو سب یاد رہتا کہ کالی ڈائری میں بیس نعتیں ہیں، لال ڈائری میں تازہ غزلیات ہیں، ہری ڈائری میں چالیس نظمیں ہیں اور نیلی ڈائری میں پندرہ آزاد نظمیں لکھ دی گئی ہیں۔ لیکن وہ ڈائریاں جاتی کہاں ہیں؟ یہ کسی کو کچھ خبر نہ ہوتی۔ جس پر میری خبر ضرور لی جاتی۔

ایک دن میں نے بھی ڈائریوں کی گمشدگی سے تنگ آ کر ایک بڑا فیصلہ لیا کہ اور تمام ڈائریوں کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو اباجی بھی خوش ہو جائیں گے اور ڈائریوں کی روز روز کی یہ آنکھ مچولی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس ضمن میں کئی ڈائریوں کو جمع کیا گیا اور اباجی کے گوش گزار کر دیا گیا۔ اباجی نے تمام ڈائریوں کا تنقیدی جائزہ لیا اور میری توقعات کے برعکس یوں گویا ہوئے

''بھئی بیڑہ غرق وہ ہرے رنگ کی ڈائری، جس کے صفحات رنگین ہیں، وہ غائب ہے۔ اسی میں تو کلام کا اہم حصہ لکھ رکھا تھا۔''

اب کہ میں نے پھر سر پکڑ لیا اور چیخ کر دل میں یہ مصرعہ پڑھا:

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو

اب اباجی دن رات اس ڈائری کی گمشدگی کے ہجر میں گھلنے لگے اور رہ رہ کر مجھے سناتے

''تینوں تے اج تک کوئی چیز نئی ملی۔''

''بات تو سچ ہے مگر ---- آہو''

خیر کئی دن وہ ظالم ڈائری نہ ملی۔ ایک دن اچانک اباجی کہنے لگے کہ میں فلاں ہمسایوں کی طرف وہی ڈائری لے کر گیا تھا جلدی جاؤ اور ان کے گھر سے پتہ کرو۔

اب میں مرتی کیا نہ کرتی جائے واردات پر پہنچ گئی دروازہ کھلتے ہی میں نے اپنی شرمندگی چھپاتے ہوئے کہا کہ اباجی کچھ دن پہلے آپ کے یہاں تشریف لائے تھے۔ ان کی ایک ڈائری یہاں رہ گئی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں دیکھ لوں۔ بخدا میں ڈائریاں ڈھونڈنے کی ماہر ہوں۔ ان مہربان خاتون نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا کہ آپ میرے ساتھ آ جائیں لیکن میں آپ کی تسلی کروا دیتی ہوں کہ یہاں کسی قسم کی کوئی ڈائری نہیں ہے۔ ہم روز صفائی کرتے اور چیزوں کی ترتیب لگاتے ہیں۔ خیر ہم اس نامعلوم مقام (جو کہ سب کو معلوم تھا) جسے ڈرائنگ روم کہتے ہیں کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ اب میں نے ایک ماہر کھوجی کی طرح چاروں جانب نظر دوڑائی اور ایک صوفے (جس پر بتایا گیا کہ اباجی یہیں تشریف فرما تھے) کے بازو والی سائیڈ پر نیچے ہاتھ ڈالا تو سیدھا ڈائری پر ہاتھ جا پڑا۔ میں نے درود پاک پڑھ کر سیدھے ہاتھ سے کھینچ کر ڈائری نکال لی۔ ان معزز خاتون کا شکریہ ادا کر کے فاتحانہ انداز میں میں گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔

ہر سال معزز شخصیات کو حکومتی جانب سے ان کے غیر معمولی کام کی وجہ سے تمغہ حسن برائے کارکردگی سے نوازا جاتا ہے جبکہ میرا کہنا ہے کہ ایک چھوٹا موٹا پرائیڈ آف پرفارمنس گھر والوں کے لیے بھی ہونا چاہیے، جو ڈائریاں ڈھونڈتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

”ٹشو پیپر“

وہ پھر خواب دیکھ رہی تھی۔ خوابوں کی وادی میں گھومنا اور اپنی مرضی کی زندگی گزارنا اُس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بچپن سے ہی حسرتوں اور محرومیوں کی شکار سویرا کو بس خوابوں میں ہی من پسند زندگی ملتی تھی۔ آج بھی وہ ایک لمبے سفر پر تھی۔ منزل نامعلوم مگر وہ ٹرین میں بیٹھی تھی۔ سب سے پچھلے ڈبے کی آخری سیٹ پر وہ اِردگرد کے دوڑتے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ناگاہ اُس کی نظر کھڑکی سے باہر اُٹھ گئی۔ گاڑی پہاڑی علاقوں سے گول گول گھوم کر گزر رہی تھی۔ اُس نے ذرا آگے ہو کر جھانکا۔ انجن بھرپور شور مچاتا ہوا اُس کے سامنے تھا۔ اور ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی اُسے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اِس حیرت انگیز اور دلفریب نظارے میں کھوئی رہی۔ اچانک ڈرائیور نے کھڑکی سے جھانکا۔ وہ اُسی جانب دیکھ رہی تھی۔ ڈرائیور کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اُس نے گھبرا کر نظریں جُھکا لیں اور سر سیٹ سے ٹکا دیا۔

اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ڈرائیور نے جب اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی چلا گیا۔ وہ گھبرائی تو ضرور پر یہ سب کچھ اچھا لگا۔ اُس کا دل مچلنے لگا۔ آنکھیں اِس منظر کو دوبارہ دیکھنا چاہتیں تھیں۔ اُس نے کھڑکی سے سر باہر نکالا۔ انجن اُسی رفتار سے جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں نے ڈرائیور کو ڈھونڈا اور اُسی لمحے پھر اُس جسیم اور خوبصورت شخص نے پیچھے دیکھا۔ اب کی بار وہ زیادہ نہیں گھبرائی۔ وہ شخص اُسے پہلی نظر میں اچھا لگنے لگا تھا۔ اچانک ایک بے حد سرسبز لمبے درختوں اور پھولوں سے بھرے خطہ زمین پر ٹرین رُک گئی۔ وہ ایک خطرناک موڑ تھا۔ یہاں سے ٹرین رُک کر گزرتی تھی۔

اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ اتنے خوبصورت منظر میں وہ کھو سی گئی تھی۔ اچانک اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کے قریب ہے۔ وہی خوبصورت اور قدرے فربہ شخص اُس کے سامنے تھا۔ وہ بھی کسی انوکھی کشش کا شکار ہو کر چلا آیا تھا۔ وہ ٹرین سے اُتری اور سبز مخملی فرش پر چلتی پہاڑ کی چوٹی سے نیچے جھانکنے لگی۔ پہاڑوں کے نیچے بنے کھپریل کی چھتوں والے گھروں میں لڑکیاں تتلیوں کی طرح چلتی پھرتی کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایک

آسنا تھ کنول

درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اور نیچے چلتی دوڑتی زندگی کو دیکھنے لگی۔
نیلی آنکھوں والی لڑکیاں نل سے پانی بھر رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ وہ حسرت سے اُنھیں دیکھنے لگی۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ کوئی اُس کے قریب ہے۔ وہی خوابناک سا شخص اُس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ اتنا قریب تھا کہ اُس کی گرم سانسیں اُسے اپنے کندھوں پر محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ مُسکرا رہا تھا۔ سویرا کو حوصلہ ہوا۔ زندگی گزارنے کے لیے کتنے جذباتی سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ شخص ایک مہربان سہارے کی طرح اُس کے ساتھ ہے۔
اِن حسین مناظر میں وہ زندگی گزار دینا چاہتی تھی کہ اچانک اُسے بڑی بھابی کی کرخت آواز اپنی روح سے ٹکراتی محسوس ہوئی۔ ''سویرا کی بچی اُٹھ جا سکول نہیں جانا۔ لیٹ ہو گئی تو بھائی صاحب حمایتی بن کر آ جائیں گے ۔ مصیبت میری جان کے لیے رہ گئی ہے۔ مفت کا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ سر سے اُترتا بھی نہیں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔
سویرا بے دلی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا ۔ مگر بھابی کو کون سمجھائے۔ نہ ماں باپ ، نہ اور کوئی بہن بھائی۔ ایک ہی بھائی تھا جو شادی شدہ تھا۔ اور سویرا ماں باپ کی وفات کے بعد اُس کی ذمہ داری تھی۔ وہ خود بھی چار بچوں کا باپ تھا۔ اخراجات بہت تھے۔ یوں سویرا اپنی بھابی کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی۔ وہ سہمی سہمی سی گھر میں پھرتی۔ کسی ملازمہ کی طرح جھڑکیاں کھاتی اور کام کرتی رہتی۔ اندر ہی اندر آنسو بہاتے اچھے دنوں کی آس میں اُس نے خوابوں میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ خواب ہی تھے جو اُسے زندہ رکھتے تھے۔ ورنہ اب تک وہ کسی بے مصرف چیز کی طرح ٹھکانے لگ چکی ہوتی۔
آنکھوں میں خواب کی کرچیاں چبھ گئی تھیں۔ وہ خواب کے ٹکڑے سنبھالتی اُٹھی۔ بچے ابھی سو رہے تھے مگر اندھیرے منہ ہی اُس کے دن کا آغاز ہو گیا تھا۔ پاؤں میں چپل گھسیٹتی وہ باتھ روم میں جا گھسی۔ مندی آنکھوں میں خواب کسی یاد کی طرح گھوم رہا تھا۔ وہ اتنے حسین تصور سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مگر زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنا ہی اُس کی زندگی تھا۔ وہ خوابوں میں کھوئے کھوئے ہی زندگی کی تلخیاں بھلائے سب کچھ کرتی چلی جاتی ۔ ہر تلخی سہہ جاتی۔ حرفِ شکایت زبان پر لاتی بھی کس کے لیے ۔ سُنتا کون؟ بھائی تو دو دو جگہ نوکری کرتا۔ تب وہ گھر کی ضروریات پوری کر پاتا تھا۔
آج کا خواب بالکل انوکھا تھا ۔ اِک نئی خواہش نے اُس کے وجود میں جنم لیا تھا۔ اِک ہمدرد اِک غم گسار کی خواہش۔ یہ خواب

یہ نظارے خواہش بن کر اُس کے نازک وجود میں تھرکنے لگے۔ وہ اِسی حسین تصور میں زندگی گزارنے لگی۔ وقت کا پہیہ چلنے لگا۔ سویرا نے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔ وہ کالج میں جانا چاہتی تھی مگر بھائی کی کم آمدن اِس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اُس نے پرائیویٹ پڑھنے کا ارادہ کرلیا۔ ہمسائیوں کی لڑکی سے اُس نے پرانی ایف اے کی کتابیں اور نوٹس لے لیے تھے۔ خوابوں کی تکمیل اور تعبیر تعلیم سے منسلک تھی۔ اچھی تعلیم سے ہی وہ اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرسکتی تھی۔ وہ خواب تو آنکھوں سے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ ٹرین کے اُس ڈرائیور کا مہربان سراپا اب بھی اُس کے روم روم میں خوشبو بن کر بسا ہوا تھا۔ بھابی نے پڑھائی کی بھرپور مخالفت کی۔ بھائی کو اُکسایا کہ اُس کی شادی کردے۔ بھائی بھی جلد سے جلد اِس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ اُس کی ایک بھی نہیں سُنی گئی۔ ایک جاننے والے نے دوسرے محلے میں اُس کا رشتہ طے کروا دیا۔ بغیر جہیز تین کپڑوں میں وہ بھائی کے سر سے اُتر گئی۔

تیس سال کا ایک نشئی جس کی اپنی دُکان تھی، سویرا کا مجازی خدا بن گیا تھا۔ سارا دن نشہ کرتا اور پان سگرٹ بیچتا۔ جو کچھ کماتا وہ نشہ پورا کرنے پر لگا دیتا۔ سویرا کی شکل میں اضافی ذمہ داری نے اُسے سیخ پا کر دیا تھا۔ مگر اپنی زبردست قسم کی ماں کو وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جس نے بیٹے کو سدھارنے کا یہ اچھا راستہ ڈھونڈا تھا۔ ایک خوبصورت، معصوم اور غریب لڑکی کو جو میٹرک پاس تھی اپنے جاہل گنوار اور نشئی بیٹے کے سر منڈھ دیا تھا۔ سویرا کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ شفیق میں وہ اِک مہربان مسکراتے ہوئے شخص کو ڈھونڈتی۔ مگر وہ تو صرف ظلم کرنا جانتا تھا۔ دکانداری کرتا، نشہ کرتا اور پھر سارا نشہ سویرا پر اُتار دیتا۔ رات وہ شفیق کے نام کے برعکس ایک ظالم اور گنوار سے کسی خوشی کی بھیک مانگتی اور سارا دن ایک تھانیدار قسم کی جابر ساس اُس سے جانوروں جیسا برتاؤ کرتی۔ وہ کیا کرے۔ کس سے کہے۔ بھائی تو اُسے بیاہ کر بھول گیا تھا۔ پھر ایک وہ ہوا جسے وہ جانتی تھی کہ جلد ہونے والا ہے۔ ظلم وستم میں اِک اور اضافہ ہوا۔ طلاق دے کر اُسے گھر سے نکال دیا گیا۔

وہ داغ داغ روح اور داغ داغ بدن لیے مزید ظلم سہنے کے لیے بھائی کے گھر آ گئی۔ زبان پر کبھی چپ کا تالہ ڈالے وہ سارا دن بھابی کے طعنے سنتی۔ بچوں کی جھڑکیاں برداشت کرتی۔ دو وقت کی روٹی کی خاطر وہ کسی جانور کی طرح کام کرتی رہتی۔ اب ایک اور تبدیلی بھی آ گئی تھی۔۔۔۔ اُس نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے تھے۔

خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ ان کی تعبیر کبھی نہیں ملتی۔ مگر ایک خواب اب بھی اُس کے لاشعور میں ٹیس بن کر اُبھرتا تھا۔ آج اتوار

کا دن تھا اور بھائی گھر پر تھا۔ باہر دھوپ میں بیٹھا وہ پنڈلیوں پر تیل مل رہا تھا۔ ''لاؤ بھائی سر میں مالش کر دوں'' اُس نے تیل کی شیشی پکڑ لی۔ ''ٹھیک ہے لگا دو۔'' وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بھائی کو تیل لگاتے لگاتے وہ سوچتی رہی کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ کتنے ہی دنوں سے وہ ہمت جمع کرتی رہی تھی۔ ''بھائی جان---'' بالآخر اُس نے کہنا شروع کیا۔ ''بولو'' ''میں ایف اے کے پیپر دینا چاہتی ہوں۔'' ''کیا؟''

بھائی چونک کر سیدھا ہوا۔ اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''اب کیا کرو گی پیپر دے کر؟'' ''بھائی پاس ہو گئی تو کسی سکول میں نوکری کر کے آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ اخراجات بھی تو بہت ہیں۔'' بھائی کا سر جھک گیا۔ جیسے وہ اپنی ماضی کی زیادتیوں پر شرمندہ ہو رہا ہو۔ ''اچھا میں کچھ سوچتا ہوں۔'' ''بھائی میں تیاری کر رہی ہوں۔ آپ داخلہ بھجوا دو۔ آج کل داخلے جا رہے ہیں۔ میں پاس کر لوں گی بھائی۔'' وہ لجاجت سے بولی۔ ''اچھا کچھ کرتا ہوں'' وہ نیم دلی سے بولا۔ اُس کی ذرا سی رضا مندی دیکھ کر پہلی دفعہ ہلکی سی خوشی نے سویرا کے چہرے پر روشنی کی لہر بکھیر دی۔ جسم میں خون دوڑنے لگا۔ وہ دعا مانگنے لگی کہ بھائی اُس کا داخلہ بھیج دے۔

اگلے دن اُس کی بھانجی نے اُس کے سٹور نما کمرے میں جھانکا۔ ''پھپھو۔ ابا پوچھ رہے ہیں کہ داخلہ فارم کہاں سے ملتے ہیں؟'' ''تمہیں پتہ تو ہے۔'' ''مجھے نہیں پتہ'' وہ اٹھلاتی ہوئی بولی۔ ''انٹرمیڈیٹ بورڈ کے دفتر سے ملتے ہیں۔'' اُس نے بتا دیا۔ خوشی نے اُس کی آنکھوں کو چھوا۔ خواب لپکنے لگا۔ بھابی کے کانوں تک آواز پہنچی تو ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اِک مایوسی نے ماحول کو جکڑ لیا لیکن اب کی بار بھائی نے بآواز بلند کہہ دیا کہ وہ سویرا کا داخلہ بھیج رہا ہے۔ بھابی اندر ہی اندر جلتی کڑھتی چپ ہو گئی۔ طعنوں اور کوسنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید میرے خواب کی تعبیر مجھے مل سکے۔ اُس نے تلخ ماضی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

وقت کا چکر پورا ہوا۔ سویرا نے ایف اے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اِس کامیابی نے اُس کے اندر اعتماد بھر دیا تھا۔ قریب کے پرائمری سکول میں اُس نے درخواست دی اور اُسے نوکری مل گئی۔ ایک دن اُس نے اپنی بھابی کو سمجھانے جانے کی کوشش کی۔ ''بھابی میں نوکری کر کے اخراجات میں آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں۔ بھائی کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ میں بھائی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی اور ہماری ثمی بھی اب جوان ہو رہی ہے۔ وہ کالج میں پڑھنا چاہتی ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ وہ بہت پڑھے۔ آفیسر بنے اور اچھی زندگی گزارے۔'' بھابی نے حقیقت کا آئینہ دیکھا تو چپ ہو گئی۔ یہ تو اُس کی خواہش بھی

تھی۔ سویرا کے نئے اقدام اور کامیابی نے گھر والوں کا رویہ بدل دیا وہ صبح سارے کام ختم کر کے سکول جاتی۔ سکول سے واپس آ کر پھر گھر کے سارے کام کرتی اور رات کو بی اے کی تیاری کرتی۔
پہلی تنخواہ اُس نے بھابی کے ہاتھ پر رکھی پیسے کم ہی سہی پر پیسوں کی اہمیت کم نہیں تھی۔ بھابی نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ داغ داغ چہرہ اور بدن بے رونق۔ تاہم آنکھوں میں اُمید کی چمک تھی۔ ''ٹھیک ہے کچھ عرصہ نوکری کر لو۔ میں نے ماسی سے کہہ دیا ہے کہ کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ کر دے۔ جوان لڑکی کو ساری زندگی گھر میں تو نہیں بٹھایا جا سکتا۔'' بھابی نے تلخ بات کر ہی دی۔ اُس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ سویرا کی ملازمت سے خوش ہے مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔ اُس کی بات نے گویا پُرسکون ندی میں پتھر پھینک دیا۔ اِک ٹیس سویرا کے سارے بدن میں پھیل گئی۔ شفیق کے ساتھ گذارے تلخ لمحے اِک درد بن کر اُس کے وجود میں پھیل گئے۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔
بھائی کی یہ مہربانی کم تھی کہ اُس نے پڑھنے دیا اور نوکری کرنے دی تھی۔ وہ جیتا جاگتا انسان تھی کہ ایک ٹشو پیپر جس کو ہر کوئی استعمال کر کے پھینک دینا چاہتا تھا۔ کب تک وہ ٹشو پیپر بنی رہے گی۔ یہ سوچتے آنسو اُس کا بستر بھگونے لگے۔ وہ پھر سے اِک خواب کے دھارے میں تھی۔ وہی ٹرین اور اُس کا مہربان ڈرائیور کوئی تو مہربان ہوتا۔ بھابی پھر مجھے کسی دُکھ کی صلیب پر لٹکا دے گی۔ شادی کے نام سے ہی سویرا کو نفرت تھی۔ کیا کرتی کسی کے آگے بول بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر بولتی تو سانس لینے کی اجازت بھی چھن جاتی۔
اگلے روز وہ اپنے ہی دھیان میں سکول جا رہی تھی۔ جب اچانک موڑ مڑتے ہی ایک نرم سے وجود سے ٹکرا گئی۔ سوری کہہ کر وہ سانس درست کرتی بغیر دیکھے کہ ٹکرائی کس سے تھی سکول کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ سکول میں گھس کر اُس کی جان میں جان آئی تو خیال آیا ٹکرانے والا نجانے کون تھا۔ جوان تھا یا بوڑھا۔ مگر بہت نرم وجود تھا۔ اب تک وہ اس کا لمس اپنے وجود پر محسوس کر رہی تھی۔۔ اچانک ہی اُس کے خواب کا مہربان شخص اُس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ اُسے لگا جیسے وہ اُس کے خواب والا شخص تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اُس سے ٹکرانے کا لمس ویسا ہی تھا جیسا کہ خواب والے شخص کا لمس۔ جو اب تک اُس کے وجود کا حصہ تھا۔ وہ اُس خوشبو سے بھرے لمحے کو کبھی بھلا نہیں پائی تھی۔ سکول میں سارا دن وہ اُس ٹکرانے والے شخص کا موازنہ کرتی رہی۔ کاش وہ اُس کی شکل دیکھ سکتی۔ اِک افسوس اُس کے وجود میں سرایت کرنے لگا۔
چھٹی ہو گئی تھی۔ اُسے پھر اُسی موڑ سے گزر کر

جانا تھا۔ وہ چوکنی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسے مایوسی ہوئی چاروں طرف کوئی نہیں تھا۔ اِک بے نام سی اُداسی اُس کے وجود پر چھانے لگی۔ کاش وہ دوبارہ اُسے دیکھ سکے یا مل سکے۔ کتنی دیر وہ سوچتی رہی۔ اُسے ایسا کیوں لگا تھا کہ خواب والے شخص اور ٹکرانے والے شخص میں کوئی مماثلت ہے۔ یہ میرا وہم ہے۔ اُس نے سوچا اور سر جھٹک کر کاموں میں لگ گئی۔ کتنے ہی دن گزر گئے۔ وہ اُس واقعے کو تقریباً بھول چکی تھی۔ جب اچانک پھر ایسے ہی ایک واقعے نے اُس کی زندگی بدل ڈالی تھی۔

وہ آج بھی سکول کے لیے نکلی تھی۔ تیز تیز قدم اُٹھاتی وہ اُسی موڑ پر پہنچی تھی جب وہی شخص اُسے ایک طرف رُکا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنے وجود میں ساکت ہو گئی۔ چلتے قدم رُک گئے۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ مہربان مُسکراتا ہوا۔ اچانک اُس نے دیکھا وہ ذرا سا جھک کر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اُس کی نظر نیچے گئی۔ چھوٹی سی سائیکل پر ایک بچہ اُس کے ساتھ تھا۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں کا پیکٹ پکڑے اُس کے ساتھ چل رہا تھا۔ مرد نے سرسری نگاہوں سے اُدھر دیکھا۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ وہ تو شادی شدہ اور بچوں والا تھا۔ پھر مایوسی نے اُس کے وجود کا گھیراؤ کر لیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے سکول کی جانب چل پڑی۔ میں خواب کیوں دیکھتی ہوں؟ وہ خود سے لڑتی لڑتی تھک جاتی۔

وقت دبے پاؤں گزر گیا۔ ثمی کالج جانے لگی۔ باقی بچے بھی بڑی کلاسوں میں آ گئے تھے۔ سویرا نے اپنی مدد آپ کے تحت بی اے اور پھر ایم اے کر لیا۔ اب وہ مڈل سکول کی پرنسپل تھی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی۔ بھائی کی دوسری نوکری اُس نے چھڑوا دی تھی۔ اب گھر اور بچوں کی زیادہ تر ذمہ داری اُس پر ہی تھی۔ بھابی نے بھی سویرا کی خدمت اور محنت دیکھ کر رویہ بدل لیا تھا۔ اُس کے بچے جوان ہو گئے تھے۔ سویرا کے بالوں میں بھی چاندی آنے لگی تھی۔ زندگیوں کی تلخیوں سے لڑتی بھڑتی سویرا نے زندگی سے اپنا حصہ وصول کیا تو تھا۔ پر وہ خواب نہیں تھا اِک حقیقت تھی۔ جسے اُس نے خوابوں کی دُنیا سے نکل کر پا لیا تھا۔

اب وہ ایک ذمہ دار، سمجھدار اور باوقار عورت تھی۔ جلد ہی وہ ہائی سکول کی سینئر ٹیچر بن گئی۔ لڑکیوں کے لیے اُس کا رکھ رکھاؤ، چال چلن، لباس، اُٹھنا بیٹھنا سب ایک رول ماڈل کی طرح تھا۔ اُس کی بھانجی نمی نے بی اے کر لیا تو اُس کی اچھے خاندان میں شادی کر دی گئی۔ پھپھو نے سارا جہیز خود بنایا اور ثمی کو دُلہن بنایا تھا۔ کتنے ہی خواب آنکھوں میں پانی بن کر اُترے اور بہہ گئے۔ بھانجا جنید ایم اے کر رہا تھا جب کہ چھوٹا سمیر بی اے میں تھا۔ کاشانہ میٹرک میں تھی۔ بچے پھپھو کے دیوانے تھے اِس

لیے کہ اب وہ اُن کی ہر خواہش کو پورا کر سکتی تھی۔ پر اُس کے اپنے دامن میں صرف داغ تھے۔ دُکھ اور رنج تھے۔ بھابی اور بھائی اکثر اُس سے شادی کا کہتے تو وہ سختی سے رد کر دیتی۔ ایک تجربہ کافی تھا۔ آنکھوں میں آئی نمی کو دیکھ کر وہ شرمندہ ہو جاتے۔

اس روز وہ سکول پہنچی تو پرنسپل اُس کی منتظر تھی اُس کے دفتر پہنچتے ہی کہنے لگی: ''مس سویرا کل ایجوکیشن آفیسر سکول کا دورہ کرنے آ رہے ہیں۔ ان کے ویلکم کی تیاری آپ کو کرنی ہے۔ میں کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔'' پرنسپل نے سویرا کی طرف دیکھ کر تاکید کی۔ ''یس میڈم بھروسہ رکھیے۔ میں اچھی طرح سب انتظام کر لوں گی۔'' سویرا نے کام شروع کر دیا۔ ویلکم کی بھرپور تیاری اُس نے کی تھی۔ کوئی کمی نہیں تھی۔ سفید ساڑھی میں وہ خود بھی بہت شاندار لگ رہی تھی۔

ایجوکیشن آفیسر اپنے عملے کے ساتھ اپنی گاڑی سے اُترے تو وہ کسی دوسری ٹیچر کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ اُس نے دیکھا ہی نہیں ہاتھوں میں پھول تھامے وہ اچانک ہی مڑی تھی کہ ٹکراتے ہوئے بچی۔ ہو بہو وہی شکل وہی ناک نقشہ وہی قد وہی مسکراتا مہربان چہرہ۔ خواب مجسم ہو کر اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ پھول اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرے۔ وہ پھول پکڑنے کے لیے اچانک نیچے جھکی تو ساڑھی کا پلو نیچے گر پڑا تھا۔ آفیسر خود بھی اچانک ہی نیچے جھکے تھے کہ ٹیچر کی مدد کر سکیں تو پھر دونوں ٹکرا گئے۔ بدحواسی میں وہ نیچے گرنے لگی تھی کہ آفیسر نے اُنہیں اپنے مضبوط ہاتھوں اور بازوؤں میں سنبھال لیا۔ سویرا کو غش آ گیا۔ پرنسپل اچانک آگے بڑھیں اور آفیسر کے ساتھ اُسے تھام کر آفس میں لے آئیں۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ ''انہیں ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ یہ کسی زبردست شاک کے زیرِ اثر ہیں۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ دو گھنٹوں میں ہوش میں آ جائیں گی۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر ہدایات دے کر چلا گیا۔ ''آفیسر میں شرمندہ ہوں، یہ ہماری بہت ہی باصلاحیت اور قابل ٹیچر ہیں۔ آپ آیئے اپنا کام پورا کیجیے۔'' پرنسپل نے ایجوکیشن آفیسر سے درخواست کی۔ ''ٹھیک ہے'' وہ سویرا کا معصوم سا چہرہ دیکھتے ہوئے پرنسپل کے ساتھ چل پڑے۔ اُنھیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پہلے کہیں اُسے دیکھ چکے ہیں۔ پر کہاں! یہ اُنہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔

معائنہ کرتے ہوئے بھی وہ یہی سوچتے رہے۔ کام ختم کر کے وہ آفس میں واپس آئے۔ صوفے پر مس سویرا بے سُدھ پڑی تھیں۔ ''پرنسپل صاحبہ آپ پریشان نہ ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں آپ کے سکول کی کارکردگی سے خوش ہوا ہوں۔ رزلٹ بھی شاندار ہے اور ٹیچرز کا رویہ اور پڑھانے کا طریقہ بھی متاثر کن ہے۔ آج کے واقعے سے آپ پریشان نہ ہوں۔ اس کا آپ کے سکول کی کارکردگی سے کوئی تعلق نہیں۔''

آفیسر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''سر چائے تیار ہے۔'' ''ٹھیک ہے یہیں پی لیتے ہیں۔'' ایجوکیشن آفیسر مراد خان کا دل چاہا کہ وہیں مس سویرا کے پاس بیٹھے رہیں۔ یہ کیسا تعلق تھا وہ خود نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ اُنہیں مس سویرا کے لیے دل میں عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ اِک غیر کے لیے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی تھی۔ وہ خود حیران تھے۔ یوں جیسے کوئی صدیوں پرانا تعلق تھا۔

چائے پیتے ہوئے وہ بار بار سویرا کو دیکھتے رہے۔ ہمدردی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اُس سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سویرا نے تھکی سی سرخ آنکھیں کھول دیں تھیں۔ مراد خان اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اِک مہربان سی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ سویرا نے جلدی سے پلو درست کیا۔ وہ اُٹھنے لگی تھی۔ مراد خان نے اُسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

''پلیز آپ آرام کیجیے۔'' وہ بے یقینی سے اُنہیں دیکھتی رہی۔ خواب اُس کی آنکھوں میں لہریں لینے لگا۔ یہ تو اُسی ٹرین کا ڈرائیور تھا۔ اُسے خوابوں کے یوں سچ ہو جانے پر یقین نہیں تھا۔ اُس نے بالوں کو سیٹ کیا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ''آئی ایم سوری!'' آواز جیسے رندھ گئی تھی۔ آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ وہی مہربان چہرہ سامنے دیکھ کر وہ ہوش ہی کھو بیٹھی تھی۔ اچانک مراد خان اپنی کرسی سے اُٹھے اور اُس کے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ ایک نرم سا ہاتھ اُس کے کندھے پر آیا۔ مہربان چہرے کے گرم سانسوں کی تمازت نے اُس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ سچ تھا۔ آنکھیں چھلکیں تو مہربان اُنگلیوں نے آنسوؤں کو اپنی پوروں پر روک لیا۔ ''یہ قیمتی موتی ضائع کرنے کے لیے نہیں ہیں۔'' ایک دھیمی سی مدھم آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ روح میں جیسے جلترنگ بجنے لگے تھے۔

''کبھی خواب سچ ہو سکتے ہیں'' اچانک اُس نے بے معنی سوال پوچھا۔ ''ہاں ہو جاتے ہیں۔'' وہ دھیمی سی پراسرار مسکراہٹ لیے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے جیسے سب جانتے ہوں۔ ''لیکن خوابوں میں بے ہوش ہونے کا کوئی رواج نہیں ہوتا'' اِک شرارت اُس مہربان چہرے پر ناچ رہی تھی۔ گرم ہاتھ کا لمس اُسے محبت کی دُنیا میں واپس کھینچ لایا تھا۔ ''اِس سے پہلے میں آپ کو جانتا نہیں تھا مگر اب یوں لگتا ہے جیسے آپ سے دل کا نہیں روح کا واسطہ ہے۔ اور یہ تعلق صدیوں پر محیط ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' وہ مُسکرائی۔ چہرے کے سارے داغ حسین مُسکراہٹ میں چھپ گئے تھے۔ ''ابھی تو مجھے جانا ہے۔'' وہ اپنا کارڈ اُسے دیتے ہوئے بولے۔ ''رابطہ رہے گا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ آپ کے سکول کی شاندار رپورٹ میں نے لکھ دی

ہے۔ ''شکریہ'' مراد خان اُس کا چین و قرار چھین کر چلے گئے۔

مراد خان کالمس لیے وہ گھر پہنچی۔ دو دن کی چھٹی تھی جب مراد خان کا فون آ گیا۔ وہ حال پوچھ رہا تھا۔ مگر یہ کیا وہ تو اپنا ہی حال بتائے جا رہا تھا۔ زندگی نے اُس کے بھی بڑے امتحان لیے تھے۔ پر زندگی سے لڑتا بھڑتا وہ یہاں تک آ پہنچا تھا۔ اُس نے شادی کی تھی۔ اُس کا ایک بیٹا بھی تھا جو اب خود شادی شدہ تھا۔ مگر مراد خان اکیلا ہی تھا۔ بیوی بیٹے کو پیدا کرتے ہی ناطہ توڑ گئی۔ یوں مراد خان نے تنہا ہی نوکری بھی کی اور بچے کو بھی پالا۔ دوستوں کے اصرار کے باوجود اُس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اکیلے ہی زندگی گزار دی۔ اب بیٹا جوان تھا پڑھا لکھا تھا۔ مراد نے اُس کی شادی کر دی تھی اور اب وہ ایک بیٹے کا باپ تھا۔ مراد خان نے اپنے اِس فرض کو تو پورا کر دیا تھا مگر اپنی تنہائی کا کوئی علاج اُس کے پاس نہیں تھا۔

عورتیں بہت تھیں۔ خواہشمند بھی تھیں۔ مگر وہ نہیں تھی جیسی وہ چاہتا تھا اور اب تو وہ زیادہ ہی تنہا ہو گیا تھا۔ بے رونق زندگی جیسے وہ ایک فرض سمجھ کر گزار رہا تھا۔ سویرا کو دیکھا تو اُسے عجیب کشش محسوس ہوئی تھی۔ اُسے سویرا میں اپنی (مرحومہ) بیوی کی پرچھائی نظر آئی تھی۔ برسوں کے زخم پھٹ پڑے تھے۔ وہ بہت دُکھی اور تنہا تھا۔ اب سویرا ہی تھی جو اُس کے رستے زخموں پر مرہم رکھ سکتی تھی۔

اُس کی کہانی سننے کے بعد سویرا نے بڑی مضبوطی سے اپنی زندگی کی ساری محرومیوں اور تلخیوں کی داستان اُس کے گوش گزار کی۔ مراد خان اُس کی داستان سُن کر کہنے لگے، ''سویرا میں تمہارے بدن اور روح پر لگے سارے داغ اپنی پلکوں سے چُن لوں گا۔'' سویرا نے مکمل یقین کر لیا اور کچھ ہی دنوں میں سادگی سے نکاح کر کے وہ مراد خان کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

اُس نے اپنا خواب مراد خان کو ایوبیہ کی سب سے اُونچی چوٹی پر دیودار کے ایک بلند قامت درخت سے ٹیک لگائے سُنایا تھا۔ وہ نیچے چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ نیلی آنکھوں والی تتلیوں جیسی وہ لڑکیاں جو پھول بیچ رہی تھیں۔ مراد خان اُس کے پیچھے آ کھڑے ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں سفید پھولوں کا ایک تاج تھا۔ وہ اُن کی طرف مڑی تو وہ تاج اُنھوں نے نرمی اور پیار سے سویرا کے سر پر سجا دیا۔ خواب کا لمس حقیقت بن کر اُس کے اِرد گرد بکھرا ہوا تھا۔ مراد کے ہاتھ اُس کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کو سمیٹ رہے تھے۔ وہ مراد کے کندھے سے سر ٹکائے آنکھیں بند کر کے اِس سچائی کو محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایک ٹشو پیپر نہیں تھی بلکہ ایک جیتا جاگتا انسان تھی۔ اُس کا خواب سچ ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

لنڈے بازار کے خواب [مائیکرو فکشن]

اک روز میں خوابوں کے لنڈا بازار چلا گیا ہر دکان پر بے شمار گٹھڑیاں پرانے اور نیم پرانے خواب برائے فروخت پڑے ہوئے تھے جو شہر کے امرا نے پورے ہونے کے بعد آدھی قیمت پر خوابوں کے لنڈا بازار میں بیچ ڈالے تھے کیونکہ اب نئے خواب اُن کی آنکھ کی منڈی میں بکنے کے لیے تیار تھے میں بھی اک رات خوابوں کے بازار میں استعمال شدہ خوابوں کی قیمت پوچھنے اک دکاندار کی دکان پر رک گیا میں نے پوچھا خواب ہیں؟ اُس نے اک مشاق ماہر کی طرح مجھے دیکھا اور پھر بولا کہ ہیں آئیں اندر بیٹھ کر دیکھیں انہیں میں نے پوچھا دام تو بتلایئے اُس نے کہا دیکھنے کے دام تو کچھ بھی نہیں ہاں! البتہ اگر خواب آپ کو بھا گئے تو پھر قیمت بھی طے ہو جائے گی میری حالت دیکھ کر اس جہاں دیدہ بیوپاری نے چند خواب دکھلائے مجھے ان میں کچھ خواب تھے اجلے تھے اور کچھ خوابوں پہ مٹی پڑی تھی بھاؤ تاؤ کر کے اک خواب پسند آیا میں نے اپنی پینٹ کی جیب سے چند سکے نکالے اور دوکاندار کو دیئے میرے سکے دیکھ کر وہ ڈر گیا اور نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا اصحاب کہف اصحاب کہف اصحاب کہف اس سے پہلے کہ لوگ آجاتے میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆☆☆

کھیل کا انت [مائیکرو فکشن]

جس نے میری زندگی کی کہانی لکھی وہ مصنف بہت ہی اعلیٰ ہے پہلے مٹی سے گوندا پھر غم کی بھٹی میں خشک ہونے دیا پھونک ماری کچھ ایسی مرے بے جاں بت میں یوں سارے جسم میں خوں کی روانی ہوئی اس طرح سے شروع یہ کہانی ہوئی کوئی راجہ ہوا کوئی رانی ہوئی میرے حصے کا جتنا بھی کردار تھا خیر و شر میں منقسم ہو گیا پھر دنیاداری کے چکر میں ڈالا میں بھٹکنے لگا تو مصنف نے اس کہانی میں کچھ ایسے شک بھر دیئے جن سے مرے ہم زاد سے جھگڑے شروع ہو گئے میں پریشان تھا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا جو میرے دل کی دھڑکن میں تھی وہ میرے خوں سے کیوں کم ہونے لگی پھر مری روح نے جا کے دستک جو دی اُس کے دل کہ در پر امین تو دل کی دیوار سے ایک پرچی ملی جس پہ لکھا ہوا یہ ملا تیرا کردار امین اب مکمل ہوا اب مصنف کی مرضی ہے کہ تجھے کٹ کرے اور تیرے سانسوں کی ڈوری توڑ کر اک نئے کردار کو اتر کرے جو تیرے پیار کا سہارا بنے تیری قسمت میں لکھی ہوئی مات ہے کھیل کے انت میں بھی یہ مات قائم رہے۔

☆☆☆☆☆

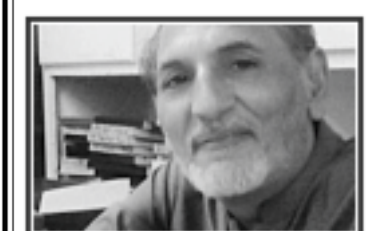

محمد امین کنجاہی

''راہزن''

دسمبر کا مہینہ بھی عجیب مہینہ ہے۔ کبھی دھوپ میں نہایا تو کبھی دُھند میں ڈوبا ہوا۔ اس مہینے کے آخری دنوں سفر کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ جب چاہیں دُھند کے بادل آپ کے سفر کو روک کر آپ کو گاڑی میں ہی مقید کر سکتے ہیں۔

یہ پچھلا دسمبر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جہاں ساری دنیا کے موسموں میں کافی بدلاؤ آیا ہے وہاں پاکستان بھی اس تبدیلی سے بچ نہیں سکا۔ ماہ کے شروع میں سردی آنے کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن آخری دنوں میں خوب سردی اور دُھند اُترنے لگی۔ جب دُھند کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے تو وہیں موٹروے سفر کے لیے بند ہو جاتی ہے اور لوگ سفر جاری رکھنے کے لیے جی ٹی روڈ کی طرف منتقل ہونے لگتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست ہیں نام تو اُن کا حافظ غلام رسول ہے، وہ نعت شریف پڑھتے ہیں مگر ہم سارے دوست اُن کو پیار سے ''نعت خواں صاحب'' ہی پکارتے ہیں۔ اُن کے نام کی طرح ان کے قصبے کا نام بھی بہت پیارا ہے، مصطفےٰ آباد۔ وہ مدحت خواں ہیں نبی کے گھرانے پاک کے، کیا خوب نعت لکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ مالک پاک نے اُن کو لحن داؤدی سے نوازا ہے۔ جب وہ مکمل وجد میں سُر سے کلام پڑھتے ہیں--- رنگ برنگے لباس میں ملبوس-- شانے پر تیرتے لمبے لمبے گیسو--- مشیخ خوشبوں سے معطر کر دیتے ہیں--- وہ حاضرین پر ایک عجب سحر کر دیتے ہیں۔ اس فرائض منصبی کے لیے اُن کو ملک کے طول و عرض میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ اُن کے چاہنے والے اُن کو دل کھول کر نذرانے پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس لیے پتہ کہ جب میرے ایک کلاس فیلو جو بینک کے منیجر ہیں، وہ اُن کو وہ نذرانے کے بلک پیسوں سے بھرا ''توڑا'' دیتے ہوئے کہتے ''اِن کو میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادیں---- کہاں اتنا کیش ساتھ لیتا پھروں گا--- تین لاکھ ہیں--- گن لیجیے گا! ابھی دو تین دن اسی علاقے میں پروگرام ہیں---- وہ دیکھیں کب گھر جانا نصیب ہوتا ہے۔'' میرے دوست کو ایک دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں پیسے کم زیادہ نہ ہو جائیں ---- منیجر صاحب بھی جلدی سے ''توڑا'' کیشئر کے حوالے کر دیتے۔ کیشئر پیسے گن کر جب منیجر صاحب کو رپورٹ دیتا تو اُن کی پریشانی ختم ہوتی۔ منیجر صاحب پیسے اُن کے اکاؤنٹ میں جمع کروا کر، اُن کو ڈیپازٹ سلپ

نجم رضوی

وٹس اپ کر دیتے۔ غلام رسول صاحب بتاتے تھے ، " نعت خوانی کوئی اُن کا پیشہ نہیں ہے"۔۔۔۔۔ پیشہ کے لفظ سے ان کو نفرت تھی۔۔۔۔ "بس شوق ہے۔۔۔۔ عشق ہے ۔۔۔۔" وہ سمجھتے تھے کہ مدحتِ سرکار کے لیے اُن کو چن لیا گیا ہے۔ اُن کی پچھلے دس پندرہ سال سے شدید خواہش ہے کہ اُن کے پاس پندرہ، بیس لاکھ کیش جمع ہو جائے تو وہ اپنا کوئی بزنس شروع کر دیں اور وہ دین کی بے لوث خدمت کریں۔ منتظمین سے نذرانے وصول کرنا اُن کو بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اس فیلڈ کو پیشہ نہ بنانے کی وضاحت کرتے مزید کہتے تھے، "ایک دفعہ نبیؐ کریم کی بارگاہ میں ایک شخص آیا جب پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کچھ نہیں کرتا تو آپؐ نے اس سے منہ موڑ لیا کہ کہیں وہ شخص دین کو پیشہ ہی نہ بنا لے۔ عجب گھرانہ ہے آلِ نبی کا کہ اپنی مدحت کرنے والوں کی ایک لسٹ بناتے رہتے۔ نام چھنتے رہتے ہیں فہرست ترتیب پاتی رہتی ہے۔ ۔۔۔ان کے ہاں۔"

اس دسمبر کی آخری راتوں میں موسم انتہائی سرد گرم ہو گیا تھا۔۔۔۔ سرد ٹھنڈی ہواؤں اور شدید دُھند کی وجہ سے اور گرم سر پر سوار قومی الیکشن کی وجہ سے۔ اُس دن بھی وہ کسی فنکشن سے لیٹ ہو گئے تھے۔ اُن کو شرقپور شریف کے مضافات کے ایک پروگرام میں پہنچنا تھا۔ سفر کرتے جب وہ کراچی موٹروے سے شرقپور شریف انٹر چینج سے اُتر کر تین چار کلو میٹر دور کانج روڈ تک پہنچا تھا۔۔۔۔ دریا کا علاقہ ہونے کی وجہ سے۔۔۔۔ دُھند ان کا استقبال کرنے کے لیے آموجود تھی۔ دُھند کے یہ بادل شام کے بعد ہی سے زمین پر اُترنا شروع ہو گئے تھے۔ تقریباً رات دس بجے کے بعد وہ مقررہ جگہ سے کوئی ایک دو کلومیٹر دور رہ گئے تھے شدید دھند کے باعث حدِ نظر چند گز ہو رہی تھی اور گاڑی کی رفتار تقریباً پیدل مسافر جتنی ہو چلی تھی۔ پتہ ہی نہ چلا جیسے بلی دبے پاؤں آتی ہے اور اپنے شکار پر حملہ کر دیتی ہے ۔۔۔ چند مسلح اشخاص نمودار ہوئے اور اُن کی گاڑی کو گھیر لیا اور گاڑی سے اُترنے کا حکم دیا۔ غلام رسول صاحب اور ان کے ڈرائیور نے بڑی سعادت مندی سے مطلوبہ رقم اور موبائل فونز اُن حملہ آوروں کے حوالے کر دیے۔ اس "خیرات بالجبر" کے بعد حالات کا جائزہ لیا تو بہت سارے علاقے کے "مخیر" حضرات ادھر ہی تھے۔ شرقپور شریف کا علاقہ امرود اور سبزیوں کا گڑھ ہے، پھل اور سبزیوں کے آڑھتی اور وہ بیچارہ شیخ جس کا دریا کے کنارے خربوزے کے کھیت تھے وہ ان افراد میں شامل تھے۔ اُن میں سے اُسی ٹاؤن کا کونسلر بھی لٹنے والوں میں شامل تھا۔۔۔۔ اُس علاقے کے سارے تھانے ٹاپنے کے کام اُسی کے حصے آتے تھے۔ وہ اپنے علاقے میں ایک رسہ گیر کی حیثیت سے مشہور تھا۔۔۔۔ اپنے ایم این اے کو ہر بار جتوانا بھی اُس کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ ماشاءاللہ وہ دس پندرہ سالوں سے یہ کام بڑے احسن طریقے سے کر رہا

تھا۔اس الیکشن کے بعد اسے امید تھی کہ اس کی پروموشن ہو جائے گی اور وہ چیئرمین کا الیکشن لڑے گا۔ کونسلر صاحب اور غلام رسول صاحب گردن اونچی کر کر کے راہزنوں کی طرف دیکھ رہے کہ شاید اُن کو کوئی مجرم پہچان لے اور اُن کو چھوڑ دیا جائے ۔''خیرات'' کرنے والے عجز و انکساری کے ساتھ رہزنوں کے حضور سڑک کے کنارے کماد کے کھیت میں کچھ اُوندھے منہ خاک بسر تھے تو چند پہلو کے بل۔۔ نوجوانوں کی ہمت سے خائف ہوتے ہوئے، ڈاکوؤں نے چند نوجوانوں کے ازار بندوں سے اُن کی کلائیاں بھی باندھ رکھی تھیں۔ نئے آنے والے مہمانوں کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیا گیا۔ حکم کی بجا آوری کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ دو گن مین اُن پر مامور تھے جو ذرا سی بھی حکم عدولی پر گولی مارنے کا حکم سنا رہے تھے۔ اُس وقت سب کو اندازہ ہو گیا کہ اسلحہ بردار اور نہتے انسان میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔۔۔ بندوق کی نوک پر کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکومت کی طرف سے سخت احکامات تھے کہ دُھند میں سفر سے اجتناب کیا جائے۔ لگتا تھا کہ ڈاکو اِن حضرات کو حکومت کے احکامات نہ ماننے کی سزا دے رہے تھے۔ اِن حالات میں اگر کوئی احکامات کی پابندی کر کے اپنی جان کو محفوظ بنائے ہوئے اپنے گھروں کو جائے پناہ بنائے ہوئے تھے تو وہ پولیس کے جری جوان تھے جو تھانوں میں چھپ کر بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور سانحہ ہو گیا۔ اس راستے سے تھوڑی دُور ایک قصبے سے چند افراد اِن لٹنے والے لوگوں میں شامل تھے وہ اپنے ''کھوہ'' کی طرف آتے ہوئے واپسی پر ان رہزنوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ یہ نور کا برادری کے افراد تھے۔ جب اُن کے گھر والوں اور چند احباب نے انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی دیکھیں تو وہ ان کو اُن کے ڈیرے سے لینے نکل پڑے۔ یہ راستہ دریا کے بند کی طرف سے سڑک کی طرف آتا تھا۔ وہ چار پانچ نوجوان ساتھی تھے ۔ اُن کے ساتھ ''اشرف شاہ جی'' بھی تھے جو دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا باپ تھا۔ گھر سے نکلتے وقت اُنہوں نے احتیاط۔۔۔۔۔ خیر سگالی کے طور اپنی پرانی دونالی بندوق ساتھ لے لی تھی۔ اب وہ اُن لٹتے ہوئے لوگوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اسی رستے سے گزر کر انہوں نے مطلوبہ ڈیرہ پر جانا تھا۔ اُن کی آپس کی گفتگو کی آوازیں جائے وقوعہ تک پہنچنا شروع ہو گئیں تھیں۔ لٹیرے یکدم خاموش ہو گئے۔ جب یہ مختصر سا قافلہ اُن کے قریب پہنچا تو ڈاکوؤں کے ایک ساتھی نے شاہ جی کے کندھے پر بندوق دیکھتے ہی اُن کو گولی مار دی ---- جھٹ سے بندوق چھین لی۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے رہزنوں نے سب کو پکڑ کر اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ گولی شاہ جی کے پیٹ میں پیوست ہو چکی تھی۔ خون کا فوارہ اُن کے پیٹ سے اُبل رہا تھا۔ اُن کو اور ان کے ساتھیوں کو بھی ساتھ ہی کھیت میں لیٹنے کا حکم

صادر ہو چکا تھا۔ زخمی کے ساتھی منت سماجت کر رہے تھے کہ زخمی کو ہسپتال لے جانے کی اجازت دی جائے۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈاکوؤں کے جسم میں گوشت پوست کا لوتھڑا تھا ہی نہیں۔ کسی چیخ و پکار کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کسی سے بھی ڈر نہیں رہے تھے---- کسی سے ڈرتے تو وہ تب اگر وہ اللہ سے ڈر رہے ہوتے ---- زخمی کے پیٹ پر کپڑا باندھ دیا گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر وحشت اور جسم میں کمزوری کے تاثرات بڑھتے جا رہے تھے۔ کپڑا خون سے لتھڑ چکا تھا۔ زخمی کے دوستوں کی بے بسی میں اور مضروب کی تکلیف میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ زخم پر رکھے کپڑے سے خون رستا رہا۔ وقفہ وقفہ سے زخمی کے ساتھی ان ڈاکوؤں کے ترلے کرتے رہے ---- واسطہ دیتے رہے کہ زخمی کو ہسپتال لے جانے کی اجازت دی جائے۔

رہزن لوگوں کو اپنی مرضی سے اور تسلی سے لوٹتے رہے۔ اگر کسی کو جلدی نہیں تھی تو وہ رہزن تھے، اگر کسی کو ڈر خوف نہیں تھا وہ رہزن تھے۔ اگر کوئی آزاد تھا تو وہ رہزن تھے۔ جو بھی فیملی گاڑی پر یا موٹر سائیکل پر اُس طرف آیا دھر لیا گیا۔ ایک اکیلا نوجوان موٹر سائیکل سوار بھی پکڑ لیا گیا۔ ایک بڑی معزز فیملی آئی۔ اُس میں سے ایک عورت بھی تھی اس نے زیور پہن رکھا تھا لیکن اس عورت نے ڈاکوؤں کو پتہ چلنے سے پہلے ہی اپنی کانوں کی سونے کی بالیاں اُدھر گھاس میں پھینک دیں۔ دو تین گھنٹوں میں ہی رہزنوں کے ہاتھوں لٹنے والوں کی تعداد پندرہ بیس ہو گئی۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر کے بڑے ڈاکٹر صاحب بھی اس دام میں پھنس چکے تھے۔ سب کو ایسے ٹریٹ کیا جا رہا تھا کہ جیسے وہ کسی باڑہ میں قید بھیڑ بکریاں ہوں۔ بچارے لوگ اندر ہی اندر کڑتے رہے --- سلگتے رہے--- کھسر پھسر کرتے رہے--- اور سوچتے رہے--- آخر اُن کے ایسا کیوں ---- آخر ایسا کیوں؟؟؟--- کوئی بھی یہاں محفوظ نہیں ---- آخر ہمارا معاشرہ ہمیں کہاں لے جا کر دم لے گا ---تقریباً کوئی چار گھنٹے تک لوٹنے اور تسلی کرنے کے بعد ڈاکو وہاں سے چلے گئے اور جاتے اعلان کر گئے کہ خبردار کوئی اپنی جگہ سے گھنٹہ بھر تک نہ ہلے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہر کوئی جلدی دکھلانے لگا اور وہاں سے کھسکنے لگا۔ رہائی پا کر، فیملی والے اپنے اپنے فیملی ممبر کی ڈھارس بندھانے لگے اور یقین کرنے لگے کہ کسی کو کوئی جسمانی نقصان تو نہیں ہوا۔ زخمی نوجوان کے ساتھی اپنے مضروب دوست کو جو بہت نحیف ہو چکا تھا کو زندہ ہسپتال پہنچانے کے چکر میں اور جلدی میں تھے۔ اتنے میں موٹر سائیکل والا جلدی سے رہائی پا کر اس جگہ پہنچا جہاں گھاس میں سونے کی بالیاں گرائی گئی تھیں --- وہ اس منظر کو دیکھ چکا تھا--- اُن کو اٹھایا ----- جیب میں ڈالیں اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہی وہاں سے کھسک گیا۔ وہ عورت ادھر آئی---- اُسی جگہ پر اپنی بالیاں ڈھونڈنے لگی۔

☆☆☆☆☆

جھوٹ کی سچائی

وفا یزدان منش

عرصہ دراز کے بعد وہ مسکراتا نظر آیا۔ مسکراہٹ میں آنکھوں اور ہونٹوں کو اپنے احاطے میں لینے والی لکیریں اس کے وجود کے تانے بانے اور لاچار زندگی کا سراغ دے رہی تھیں۔ اس کے دل کو تڑپانے والا نیا جذبہ اس کے لیے سکونِ قلب کا باعث تھا۔ وہ اپنی سوئی ہوئی بیٹی کے ماتھے پر انگلی کی پور سے چند لٹکے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے مدھم آواز میں یوں گنگنانے لگا جیسے الفاظ کے ہر ہر حرف کو رک رک کے ادا کر رہا ہو۔

''تم سے میری محبت پر کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوسکتا مگر تم سے بے تحاشا پیار کے باوجود میرے اندر کی چھپی ہوئی تنہائی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ جذبات محبت اولاد، والدین اور اپنوں سے کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ میرے اندر کا اکیلا پن مجھے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا ہے۔ جب تم بھی اس کا اعتراف کرو گی تو پھر ہم دونوں کی زندگی میں تارے جگمگا ئیں گے''۔ پھر وہ جھکتے ہوئے دلآرام کے بھولے بھالے چہرے کو خوب جانچنے لگا جس طرح اس کی سانسیں ارسلان کے چہرے پر جا رہی تھیں۔

ارسلان کی بیوی کے انتقال کے بعد اس کا گھر سنسان لگنے لگا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ کینیڈا جا بسا لیکن دوسری شادی تو دور کی بات ہے کوئی لڑکی اس کا دل بھی نا جیت سکی۔ اپنوں کے کہنے پر دو تین لڑکیوں سے ملا، اپنے اردگرد کی لڑکیوں پر نظر رکھی مگر ان سے اکتاہٹ محسوس کرتا تھا، کوئی دل نا جیت سکی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ پختہ سوچتا تھا اور شادی نا کرنے کی وہ یہ وجہ پیش کرتا تھا کہ اب جوشِ شباب نہیں رہا۔ دو لوگ تبھی اچھا جوڑ بنا سکتے ہیں جب ان دونوں میں سمجھ ہو، کہے بغیر ایک دوسرے کی ضروریات کو محسوس کر سکیں اور ایک دوسرے کا احساس کرنے والے ہوں۔

اپنی کولیگ کے بارہا اصرار پر اس کا رعنا سے تعارف ہو گیا۔ رعنا دو دفعہ اپنے بھائی سے ملنے کینیڈا آ کے واپس چلی گئی تھی۔ اب اس نے مستقل رہنے کے لیے ویزے کی درخواست کی۔ ارسلان پہلے سے ہی ارادہ کر چکا تھا کہ اگر شادی کرنی ہوئی تو اپنے وطن کو ترجیح دوں گا۔ ارسلان اور رعنا کی بات فضا مجازی سے ہوا کرتی تھی۔ اسی فضا میں بھی ان دونوں میں انسیت بڑھنے لگی۔ ارسلان کو یہ لگا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس

سے بات کر کے وہ مطمئن ہوتا ہے اور اس سے بات کرتے ہوئے وہ قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کے لیے سات مہینوں کا دورانیہ کافی خوشگواری سے گزرا۔ اگرچہ یہ فاصلاتی دوستی بھی ان دونوں کو ستاتی تھی، لیکن اس تکلیف کی چبھن اور کسک کا بھی اپنا ہی مزہ تھا۔ ارسلان خوش تھا کہ اس کی زندگی اور دل کی دنیا میں تبدیلی ہونے والی ہے۔

دونوں ہی شادی کے خواب دیکھ رہے تھے، بس ملاقات کی کمی تھی۔ دونوں پُر امید تھے کہ جب وہ ملیں گے تو ایک دوسرے کو ویسا ہی پائیں گے جیسا کوسوں دور پایا اور اپنے خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنائیں گے۔

ارسلان ان سالوں میں اپنی بیٹی کے لیے فکر مند تھا اور رعنا کو اس بات سے کوئی گلہ نہیں تھا بلکہ اس نے خوشی سے دلآرام کو قبول کرنے اور اپنی اولاد کی طرح پیار دینے کا وعدہ بھی کیا مگر رعنا نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ ایک ہی بیٹی ان دونوں کے لیے کافی ہے، اس سے زیادہ وہ ماں کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی اور وہ اپنی اس شرط پر قائم رہی کہ اس سے ماں بننے کی توقع نہ رکھی جائے۔ مگر ارسلان کو رعنا کی یہ بات بھاتی نا تھی پھر بھی وہ رعنا کی محبت میں خاموش رہتا۔

اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو تھیں اور ملاقات کے لمحات قریب قریب تھے۔ رعنا میں قد و قامت، حسن اور تعلیم میں کسی چیز کی کمی نا تھی۔ وہ بے حد مہذب اور خوبصورت تھی۔ ارسلان بھی اپنے اس دلی فیصلے پر مطمئن تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں میں پیار بڑھتا گیا اور ایک دوسرے کے ساتھ اچھا وقت گزار رہے تھے۔ دونوں میں کوئی ایسی بات نا تھی جو شادی کے فیصلے میں رکاوٹ بنتی۔

یہ فطری سی بات ہے کہ دو دوست اپنے ماضی کی یادیں ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں۔ بیتی ہوئی عمر کی تصاویر بھی ہر انسان کی زیست کا اہم ترین حصہ ہوتی ہیں مگر رعنا جو تصاویر ارسلان کو دکھاتی سبھی گزشتہ چھ سات سالوں کی تھیں۔ ارسلان نے ایک فطری تقاضے پر کئی دفعہ رعنا سے پرانی تصویریں دیکھنے کی خواہش کی مگر وہ ہمیشہ یہ درخواست ٹال مٹول کر دیتی۔

نتاشا جس نے ان دونوں کا تعارف کروایا تھا، جب بھی ان سے ملتی اکثر کہتی کہ دیکھنا میں نے کتنی اچھی جوڑی بنائی ہے، خاص طور پہ ارسلان کو احساس دلاتی کہ میری بہت اچھی دوست سے بہتر کوئی تمہیں نہیں ملے گی۔ گزشتہ پانچ سالوں سے میں رعنا کو جانتی ہوں، مگر میری جتنی پرانی سہیلیاں ہیں ان سب میں جو رعنا کا مقام ہے وہ کسی کو نہیں مل سکا اور میں اپنی ساری باتیں اسی کے ساتھ شیئر کرتی ہوں۔ مجھے کبھی بھی اس سے ناراضگی کا موقع نہیں ملا۔ بلکہ میرے اور سہیل کے تعلقات میں جب کبھی تیزگی

پیدا ہوتی ہے تو اسی کے مشوروں سے جلدی صلح ہو جاتی ہے۔

رعنا کا سلوک دلآرام سے ایک ماں جیسا تھا۔ دلآرام کو بھی اس کے ساتھ اتنی الفت ہوگئی تھی کہ وہ اپنے باپ کو زور دیا کرتی تھی کہ ان دونوں کی جلدی شادی ہو جائے شاید وہ اس کی گود میں ان دیکھی ماں کی ممتا کی خوشبو محسوس کر سکے۔ رعنا کو ارسلان کی محبت پر کوئی شک نہیں تھا لیکن وہ شادی کی تاریخ مؤخر کرتی جا رہی تھی۔ وہ اکثر ہی کسی کام کے ادھورے پن کا بہانہ کر کے ٹال دیتی۔ ارسلان اس کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس نے ایک دفعہ یہ ضرور کہہ دیا کہ کونسا ادھورا کام ہے؟ بتاؤ شاید اس کو پورا کرنے میں میں مدد کر سکوں۔ رعنا نے پریشانی کے عالم میں کہا کہ مجھ پر چھوڑو اگر نہ ہو سکا تو تم سے مدد مانوں گی۔ ارسلان سے رعنا کی یہ پریشانی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ وہ فکرمند رہنے لگا اور خود سے اندازے لگانے لگا کہ جس کام کے ذکر سے رعنا کی نظروں میں تشویش بھر آتی اور اس کے ہونٹوں پہ چھوٹی چھوٹی لرزشیں آ بیٹھیں ان لرزشوں کی دردناک ٹھیسیں ارسلان کو بھی محسوس ہونے لگیں بس ارسلان سوچنے پہ مجبور ہو گیا کہ یہ کوئی بڑا مسئلہ ضرور ہے۔ یہ سوچ ارسلان کو بدگمانی کی طرف کھینچی جا رہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنی بدگمانی پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی خوشیاں مٹی میں ملیں۔ اسے اب رعنا کے بغیر گزرے والے بے مہر شب و روز سیڈر لگنے لگا تھا۔

دن گزرتے جا رہے تھے، ان دونوں کے رشتے کی بندھن میں کوئی ڈھیلا پن پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ رعنا کینیڈا میں اچھی جاب میں مگن تھی اور ایک الگ اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔

ایک دفعہ جب رعنا نے ارسلان سے پوچھا کہ تمہیں مجھ میں کونسی خوبی زیادہ اچھی لگی ہے؟ تو ارسلان نے سنجیدہ چہرے اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے کہا کہ جب میں تم سے ملتا ہوں یا تمہیں دیکھتا ہوں تو قلبی مسرت محسوس کرتا ہوں اور جو پہلا جذبہ میرے اندر سرایت کرنے لگتا ہے وہ ''سکون'' کا جذبہ ہوتا ہے۔ میرا ذہن تمہارا چہرہ، تمہاری مسکراہٹ اور آنکھیں دیکھ کر ایک سکون آور احساس میں چلا جاتا ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ تمہاری تمام خوبیوں کو احاطے میں لانا جوئے شیر لانے کے برابر ہے مگر تمہاری سب سے نرالی بات یہ ہے کہ تم میرے جذبات اور میری خواہشات کو اچھی طرح سمجھ پاتی ہو۔ تم سمجھداری سے مجھ سے برتاؤ کرتی ہو۔ میری سابقہ بیگم جو بہت اچھی تھی جب میں تمہارا اور اس کا موازنہ کرتا ہوں تو تمہیں بہتر پاتا ہوں۔ اگرچہ ہر ایک میں کوئی نا کوئی کمی ہوتی ہے مگر تم مجھے اور میری فطرت کو بہت جلد سمجھ گئی ہو۔ تمہارے اخلاق اور رویے سے میں اندرونی طور پہ سکون و قرار محسوس کرتا ہوں۔

اسی سکون کی تلاش میں مرد شادی کرتا ہے۔ اس لیے اب میری سوچ کا دائرہ سمٹ کر صرف تمہاری دو آنکھوں تک محدود ہو گیا ہے اور ہر سانس کا تعلق صرف تم سے جڑ گیا ہے۔

سال گزر گیا پھر ارسلان نے رعنا سے قدرے سنجیدگی سے پوچھا تمھارا جو بھی مسئلہ ہے اب اسے حل ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مسئلے کا تعلق کسی نا کسی طرح سے ہمارے رشتے سے بھی ہوگا۔ ارسلان جو ایک سال سے ضبط کیے بیٹھا تھا اب سب کچھ بولنے لگا۔ مجھے شادی کرنی ہے اور تم سے ہی کرنی ہے، تم شادی سے بھاگتی ہو یا شادی کرنا نہیں چاہتی؟ اگر ایسی بات تھی تو مجھے شروع سے بتا دیتی۔ اب مجھے اپنا فیصلہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے تا کہ میں بھی کوئی فیصلہ کر سکوں۔ اس کے علاوہ دیکھو کہ میری اولاد تو ہے اور ایک باپ کی حیثیت سے میری یہ خواہش پوری ہو چکی ہے، مگر یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ انسان جس سے پیار کرتا ہے جس کو اپنا سمجھتا ہے اور جس سے شادی کرنا چاہتا ہے پھر اس امنگ کا دل میں پیدا ہونا کہ ان دونوں کا ایک بچہ بھی ہو۔ اولاد دو لوگوں کے پیار اور اپنائیت کی یادگار نشانی ہے۔ تم ماں بننے کے لیے تیار نہیں ہو بالکل، تمہارے اس ارادے کی بھی میں نے عزت کی اور وعدہ کیا کہ اس کا ذکر نہ کروں گا۔ تو ٹھیک ہے مگر اس کے علاوہ آخر کیا ہے؟

رعنا خاموش رہی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ یہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی کہ صبح کی نیلاہٹ مائل روشنی ہو یا رات کی تاریکی تمہاری یاد سے ایک لمحے میں میرے اندر کی دنیا پرسکون ہو جاتی ہے۔ اسی پرسکون دنیا کے ایک کونے میں تاریکی چھا رہی ہے، اسی میں روشنی آنے دو۔ وہ چلنے ہی لگی تھی کہ ارسلان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا آج میں تب جانے دوں گا جب ہم اس تاریکی کو روشنی کی راہ نا دکھا دیں گیا اور میں خود بھی اس تاریکی سے نکلنا چاہتا ہوں۔ رعنا نے التجا نے دکھ سے بھری ہوئی آواز میں کہا کہ اب جانے دو بہت جلد تمہیں بتاؤں گی۔ اس آواز کی التجا سے ارسلان کی ہمت ہار گئی وہ دوبارہ تاریکی میں ڈوبا ہوا چلا گیا۔ گھر واپس آتے ہی دلآرام نے شادی کا پوچھا تو ارسلان نے اس کے بھولے بھالے چہرے کو سہلاتے ہوئے بمشکل ہونٹوں پہ ایک بناوٹی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا: بیٹا! فی الحال تم اپنے ابو کے ساتھ وقت گزارو، شاید میں تمہاری ماں کی کمی نہ پوری کر سکوں گا۔ جس کام کے انجام تک پہنچنے کی امید نا ہو تو اس سے کیا دل لگانا!

رات کو وہ اپنا فون اٹھا کے دیکھنے لگا تو حسب معمول جتنے بھی پیغامات آئے ہوتے وہ سب سے پہلے رعنا کے پیغامات پڑھتا اور جواب دیتا۔ سکرین پہ تصویریں آ گئیں۔ ماں کی گود میں چھوٹے بچے کی، پھر تین سال بچے کی، اسی طرح چند چھوٹے بڑے بچوں کی تصاویر اوپر تلے نظر آ رہی

تھیں جن میں بہت مشابہت تھی اور آخری تصویر تیس اکتیس سال کی عمر کے شخص کی تھی۔ ارسلان حیران ہوتا گیا کہ یہ رعنا کے بھائی کی تصاویر ہوں گی۔ مگر رعنا کا ایک ہی بھائی ہے جس کی تصویر ارسلان نے دیکھی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ہوسکتا ہے کوئی اور بھائی ہو جو میں نے نا دیکھا ہو کیونکہ آنکھوں کی رعنا سے بہت مشابہت تھی۔ قدوقامت بھی رعنا کی طرح، ہونٹ، ناک اور رنگ روپ سب رعنا سے مشابہ ---- یہ کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر تک Raana is typing سکرین پہ نمایاں ہوا۔ ارسلان کے انتظار کی آنچ ابھرنے لگی۔ اچانک اس کا رنگ اتر گیا، اس کا سر چکرانے لگا اور منہ خشک ہوتا جا رہا تھا۔ گھنٹے تک وہ صُم بکم بے ہوش وحواس لیٹا ہوا تھا۔ طبیعت کے کچھ سنبھلتے ہی وہ بمشکل دیوار کے سہارے باورچی خانے تک پہنچا اور پانی پیا شاید اسی پانی نے اسے موت کے منہ سے نکال لیا۔

رعنا کا آخری میسج یہ تھا کہ میں شادی کے لیے تیار ہوں، اب یہ سچائی جانتے ہوئے تم اپنا فیصلہ سناؤ۔

ارسلان نے فون بند کر کے بیڈ پہ پھینک دیا۔ یہ دھوکا کیسے ہوا؟ سچائی کو چھپا چھپا کے جھوٹ بولتی گئی، جھوٹ کہتی رہی، اب سچائی مجھے سنا رہی ہے، وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا کہ رعنا تم نے مجھے اتنا عرصہ سچائی نما جھوٹ میں رکھا۔ اسی جھوٹ نے مرے جذبات کو کرچی کرچی کر ڈالا، اب وہ خود کو ہریالی سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کی چوٹی سے تیزی سے بنجر گھاٹ میں گرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اگلے دن رعنا کا کوئی میسج یا فون نا آیا۔ ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے یا تو رعنا کو برا بھلا سنا کے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی اور اپنے ذہن سے نکال دے یا کچھ کہے بغیر اس کو بھول جائے؟

پچھلے ڈیڑھ سال میں رعنا سے بے تحاشا محبت و پیار، مہربانی، ہمدردی اور عزت کے سوا کچھ برتا نہیں تھا۔ دوسری طرف اسیر عنا سے بھی بے پناہ محبت ملی تھی۔ وہ اس کو یہ احساس دلاتی تھی کہ کبھی اس کی زبان سے ناگوار بات نہیں نکلے گی۔ ارسلان لاپرواہی کے عالم میں کچھ گنگناتے ہوئے دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اس کو بخوبی پتا ہے کہ ایک مرد کی ضروریات کیا ہیں؟ ایک مرد کیسے خوش رہ سکتا ہے؟ وہ ایک مرد کے وجود کی گہرائی تک باخبر تھی۔ مگر نتاشا نے یہ اہم بات اس سے کیوں چھپائی؟ یا ہوسکتا ہے وہ خود اس حقیقت سے نا آشنا ہوگی۔ سوچ سوچ کے اس نے بس چھوٹا سا میسج رعنا کو بھیج دیا کہ

''سچائی واضح ہونے کے بعد ہمارے راستے جدا ہیں''

وہ نمبر بلاک کرنے لگا تھا کہ رعنا کے وئیس میسجز آنے لگے:

یہ سچ ہے کہ میں اب رعنا ہوں، یہ بھی سچ ہے کہ گذشتہ سات سال سے رعنا کے روپ اور سانچے میں سوچ رہی ہوں اور محسوس کر رہی

ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں پورے تیس سال سے اپنے جھوٹے نام رضا کے ساتھ جیتی رہی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں پورے تیس سال سے کسی لڑکی یا لڑکے سے دل نہیں لگا پائی۔ میں پورے تیس سال سچے اور جھوٹے پن کے درمیان میں لٹکی رہی، اپنے خاندان سے لڑتی رہی، معاشرے سے روٹھی رہی۔ آپریشن کے بعد پچھلے سات سال سے رضا کو الوداع کہہ کر رعنا کو میں نے اپنا بنایا مگر میرا معاشرہ جیسا رضا کو سچا نہیں سمجھتا تھا رعنا کو بھی جھوٹا سمجھنے لگا۔ اس الجھاؤ کی دلدل سے بچنے کے لیے میں نے دوسرے ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ناتاشا سے دوستی ہوتے ہی وہ کینیڈا چلی گئی اس لیے وہ اس بات سے غافل ہے۔ پھر تم مجھے ملے۔ تمہارے ساتھ رعنا ہی رہی اور رضا کا نام بھی بھلا دیا۔ میرا بھی اس دنیا میں حق بنتا ہے نا آخر؟ دوسرے لوگوں کی طرح اس دنیا میں سانس لوں، پیار کروں، پیار دوں، پیار حاصل کروں۔ اگر تمہیں اپنے ماضی کے متعلق بتاتی تو پھر کیسے تمہارا اتنا پیار مجھے ملتا جیسا ہر لڑکی کو ملتا ہے۔ کیسے میں اتنے سالوں کی حسرت پوری کرتی اور کیسے کسی لڑکے کو اپنے پورے وجود سے عشق دے سکتی تھی۔

پھر وہ اپنی باتیں کھینچ کھینچ کر پرسوز لہجے میں سنانے لگی، رعنا سچ ہے، اس کا پیار تم سے سچ تھا اور ہے، اس کی خواہش تم سے شادی کرنا سچ ہے، تم میری سچائی کو جھوٹ سمجھتے ہو، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا، میں نے تم سے وہ بات چھپائی جو کسی زمانے میں حقیقت کے روپ میں میرے ساتھ تھی اور اب میں اس سچائی کو جھوٹ جانتے ہوئے بھولنا چاہتی ہوں۔

دیکھو تم نے اپنی زندگی کے سینتیس سالوں میں سے ڈیڑھ سال مجھے دیئے۔ اس مختصر عرصے میں جو تم نے مجھے خوشی دی اس پر تم افسوس کر رہے ہو؟ حالانکہ تمہیں بھی تو اس ڈیڑھ سال میں مجھ سے کوئی رنجش نہیں پہنچی۔ نا صرف سکون قلب ملا بلکہ تمہاری زندگی سرور سے ہمکنار ہو گئی۔ مجھے اپنے کئے پر کچھ افسوس نہیں۔ میں نے شادی کی نیت کر کے تم سے دوستی کی۔ مگر آہستہ آہستہ یہ لگا کہ اپنی گذشتہ کہانی چھوڑنے کے باوجود ناخواستہ وہ مجھ سے جڑی رہی۔ میں نے تمہیں بتانے میں دیر لگا دی۔ تمہیں بتانے سے اس لیے کتراتی رہی کہ تمہیں کھونے سے ڈرتی تھی، میں اور بھی سہنے دیکھنا چاہتی تھی۔

ارسلان کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے رعنا پر ترس آیا۔ ساتھ ساتھ اسے اپنی ذات پہ بھی رحم آنے لگا مگر اس نے پھر اچانک دل سے رعنا کے لیے ترس مٹا دیا اور یہ دل میں کہا کہ چلو ڈیڑھ سال کا عرصہ جو تمہارے ساتھ گزارا تمہیں مبارک ہو، مگر میرا دل کھیلنے کے لیے نہیں تھا۔ ارسلان نے اپنی ہچکی لگتے ہوئے پھر سے اکیلے پن کے لیے بانہیں کھول دیں اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے رعنا کا نمبر فون سے ہٹا دیا۔

☆☆☆☆☆

سسرال [افسانچہ]

عاصم بخاری

فارعہ ''جھولی اٹھا اٹھا کے سسرالیوں کو
بد دعائیں دیتی
شالا بیج جوگا وی نہ راہونیں''
مجھے کیا پتہ تھا
یہ ادلہ بدلہ
اور
وٹے سٹے کی شادی کیا ہوتی ہے۔
اس سے تو میں بغیر شادی کے ہی ٹھیک تھی۔
فارعہ--- روز گڑگڑا کے ہر نماز کے بعد
یہی پہلی اور آخری دعا مانگتی
شالا میڈے سسرالیاں دا بیج جوگا وی نہ راہوے
بالآخر
ایک دن اس کی دعا پوری ہوگئی
اور
اس کے سسرالی ، سارا کنبہ قریبی رشتہ داروں کی شادی میں شرکت کے لیے جا رہے تھے کہ اچانک راستے میں گاڑی کو شدید حادثہ پیش آ گیا۔ سارا خاندان موقع پر ہی مر گیا حتی کہ کوئی بچہ بھی نہ بچا--- واقعی کوئی بیج جوگا وی نہ بچا
وہ مگر اس پر خوشی کا اظہار نہ کر سکی۔ پھر جب اس کے سر پر بیوگی کی سفید چادر رکھی گئی تو وہ بلک بلک کو رونے لگیں

☆☆☆☆☆

[بابری مسجد کے لیے]

آسماں آئینہ نہ ہو جائے
زہد ، چہرہ نما نہ ہو جائے

چمک اے ماہ شہر ہجر نصیب
رات ، دن سے سیہ نہ ہو جائے

ہر روش اک مہک کے لپٹے ہیں
آگ ہر راستہ نہ ہو جائے

اہلِ غم ، گرد ہو کے بیٹھ رہے
بتِ مرمر ہوا نہ ہو جائے

مسجدوں مندروں کے ساتھ کہیں
ریزہ ریزہ خدا نہ ہو جائے

جلتی ماں سے لپٹ گئے بچے
شہر شعلہ سرا نہ ہو جائے

زندگی کربلا سے گزرے گی
دیکھ لینا ، قضا نہ ہو جائے

کیا خبر کب خیام اُٹھ جائیں
قافلہ کب روانہ ہو جائے

اے خدا ! تیرے معبدوں کی خیر
کچھ خلافِ رضا نہ ہو جائے

دامنِ چاک پھیل کر خالد
دامنِ التجا نہ ہو جائے

خالد احمد

پرتو

آج پھر اس کی صدا آئی ہے

یہ صدا دُور کی آواز ہے دُوری کی صدا

فرحتِ جاں بھی ہے اور راحتِ احساس بھی ہے

ان کہی اس نے کہی ضبطِ فغاں کی صورت

اس کے لہجے کا ترنگ اس کی نظر کا آہنگ

ایک پَرتو ہے مرے اپنے صنم خانے کا

وہ صنم خانہ جہاں.....

میں نے دن رات سجا رکھا ہے

اپنی گمنام سی خواہش کا المناک جہاں

سید افسر ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس خامشی کے ساتھ وہ جاں سے گزر گیا
وہ شخص دیکھنے میں کچھ ایسا غنی نہ تھا

اہلیہ کی موت پر

لکھا ہوا ہے
پیمبروں کو
ازل سے تا حشر
زیرِ زمین مٹی بھی
کھا نہیں سکتی
سو مری زندگی میں
لامتنہی رفاقت کا اک
صحیفہ جو
تم پہ اترا تھا
لے کے آئیں تھیں
تم محبت کی
اک پیمبر تھیں
میرا ایماں ہے
زیرِ افلاک یا تہِ خاک
تا ابد قبر کی یہ مٹی
تمہیں بھی ہرگز مٹا نہیں سکتی

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں وہ جانِ صبا اپنا تھا

ایک التجا

جو حرف مَیں لکھوں اُسے شہکار بنا دے
ہر لفظ مِرا گوہرِ شہوار بنا دے
ہر پھُول سخن کا مِرے گلزار بنا دے
الطاف کے قابل مِرے افکار بنا دے

اے ربِ جہاں ! شعر کا انداز سِکھا دے
مَیں طائرِ بے پَر ، مجھے پرواز سِکھا دے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رگ رگ ایک تصور ایک امنگ بھرے
اک خوشبو پھولوں میں کیا کیا رنگ بھرے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شام تو ہم نے کرلی مگر
تجھ بن کیوں کر ہو گی سحر

تاریخ

گلزار بخاری

پھر کوئی پھول کھلا
لگ گئے پر تتلی کو
مست خوشبو نے کیا
محوِ سفر تتلی کو
اس سے پہلے کہ مہک دونوں کو
مرکزِ شوق پہ یکجا کرتی
آ گئے بیچ میں
دیوار اٹھانے والے
برسرِ کار ہوئے
ہاتھ دکھانے والے
گرچہ ہر بار
محبت یہ سزا پاتی ہے
پھر بھی تاریخ کو
دہرائے چلے جاتی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہلِ زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہرِ جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

اے دھرتی کے.....!

اے دھرتی کے اندھے باسی!
اب کیا ہوگا؟
کچھ تو ہوگا۔۔۔!!
کچھ ہونے کا مطلب لیکن تم کیا جانو!
تم دھرتی کے اندھے باسی اور
میں پوجا پاٹ میں بیٹھا اپنے
خواب لٹا بیٹھا ہوں
جو کچھ بھوج مقدر میں تھا، کھا بیٹھا ہوں
ہر سو پھیلی ویرانی میں آ بیٹھا ہوں
لیکن تم کچھ اپنا سوچو!
دھن دولت سے حاصل کردہ بال نہ نوچو
آہنی ناخن بڑھ تو چکے ہیں، اب تم ان سے،
اپنے بدن کی کھال کھروچو
شاید کھال کے اندر سے وہ خون برآمد ہو جائے
جو تم نے پیا تھا
مزدوروں کا، مجبوروں کا
شاید یہ جو دھن دولت کی دہشت ہے، کچھ کم ہو جائے
اور تمھاری آنکھ بھی میری آنکھ کی صورت نم ہو جائے
میرا کیا ہے!
میری چھوڑو!
میں اپنے اس آج میں، گزرے کل کی
ضرورت بھگت رہا ہوں
اب تو میری
سانسیں تک بھی رہن رکھی ہیں
آگے پیچھے، دائیں بائیں،
دیواریں ہی دیواریں ہیں
لیکن تم اتنا تو سوچو!
دیواروں کا اپنا کیا ہے
چھت کے نیچے کی دیواریں ہوں یا رستے کی دیواریں
دیواریں تو دیواریں ہیں
ہر دیوار کے ساتھ اک بندش لگی ہوئی ہے
رستہ روکنے والی دیواروں کا کام ہے، رستہ روکیں
گھر کی دیواروں کا کام ہے گھر کی سانجھ میں
بٹوارے کا بوجھ اٹھائیں
یوں لگتا ہے، دیواروں میں خالی کمرے گونج رہے ہیں
جنگل کی خاموشی جیسا سرد سماں ہے
کچھ نہیں کھلتا، کون کہاں ہے؟

خالد علیم

میں نے موت کو گیت کیا

میں نے رات کا شیرہ کھینچا
تار بنائے
تاروں میں آوازیں بھر کر
ہاتھ اور پاؤں لپیٹ لئے
انگلیوں کو سردے کے دبایا
درد کو چورا چورا کر کے
خواب کٹھالی میں ڈالا
اور دھیرے دھیرے رگڑ کے اس سے حرف بنائے
ان کو کاغذ پر چپکایا
عرضی کی
عرضی کہیں نہیں پہنچی تو غزل بنی
میں نے غزل کو گیت کیا

ایک ہاتھ میں سورج پکڑا،
اک مٹھی میں خاک بھری
ہوا کی آنکھ سے پانی چوسا اور کوزے کو
گردش دی
شاخ تاک نے رس ٹپکایا
دیوانوں کی عید ہوئی
منزل کی امید ہوئی
قدموں کی جھنکار سے رستہ بھرنے لگا
میں نے رستہ گیت کیا

آئی بہار تو صبح کے زینے سے وہ کچھ ایسے اتری
جیسے ڈوشاں کی تصویر ہو
قاش قاش کٹتے کٹتے نیچے آئی
زندگی اس کے ہونٹوں، اس کی آنکھوں
اس کی کمر میں، کولہوں میں اور سینے میں دھڑکی
تو تال بندھی
جب میں اس کے حسن کی بکل مار کے بیٹھا
شام ہوئی
میں نے شام کو گیت کیا

تال کی ضربوں اور تقسیموں سے
اس نے گنتی سیکھی
گنتی اس کی خواہشات بن کر پھیلی تو
آسمان چھوٹا نکلا
دشت امکاں سکڑ گیا
تال توازن بگڑ گیا
گیت گلے میں رکنے لگے
آوازوں کے ذرے پھٹ کر بکھر گئے
کینوس سے سب رنگ اکھڑ کر اتر گئے
ہجر کی آندھی چلنے لگی
تاب وتواں نے رخصت لی
وقت کی چیخیں سن کر موت نکل آئی
میں نے موت کو پاس لٹایا، پیار کیا
سانسیں اس کے ہاتھ پہ رکھیں
زندگی اس کو واپس کی
اور پھر موت کو گیت کیا

شاہنواز زیدی

اتنی سہانی شام

رخشندہ نوید

وہ مجھ سے بارہا یہ کہہ چکا ہے

خمار آگیں مری دونوں نگاہوں میں ستارے ہیں

ذرا سی دیر کو چھاؤں میں ان کی بیٹھ جاتا ہے اگر وہ

زمانے بھر کا نشہ گھول کر جام و سبو میں

شب اُسے پھر پیش کرتی ہے

بہت سے ننھے ننھے جگنوؤں کا رقص رہتا ہے فلک پر

یہ حلقہ بازوؤں کا گردشِ ایام کو زنجیر کرتا ہے

سفر کرتا ہے شب بھر ساتھ میرے اور اس کے غول

رنگیں بادلوں کا

اور ہر مخمور لمحہ خواب کو تعبیر کرتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا

اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

فلسطین کا دُکھ

مرے خدا مرے ربِ رحیم رحمت کر
تمام قوم پریشاں ہے اب عنایت کر

رسولؐ پاک کا صدقہ بلا کو ٹال بھی دے
مرے کریم ہمیں سابقہ جلال بھی دے

غزہ کی پٹی پہ پٹ جائیں اب یہود تمام
بھڑکتی آگ کا ایندھن بنیں ہنود تمام

تمام کفر کا گٹھ جوڑ توڑ دے یا رب
جہاں میں کفر کی گردن مروڑ دے یا رب

اے رحم کار فلسطین کو چمن کر دے
تو اس کے اُجڑے ہوئے کھیت پھر سمن کر دے

حبیبؐ پاک کی اُمت کا حال بہتر کر
تو اس کی جیب میں پھر ڈال دے زر و گوہر

تمام ملتِ بیضا کو ایک کر مولا
کرم کی رحم کی پھر کر دے اک نظر مولا

بکھر نہ جائے کہیں اُمتِ رسولِ کریم
دعائیں عاصیوں کی پھر سے ہوں قبول رحیم

یہ قہر و جبر کے دن رات ہیں الم کی شام
فنا کے بحر میں ڈوبے یہودیت کا نظام

مرے کریم فلسطینیوں کو کر آزاد
ہر اک عدو رہے ان کا جہان میں برباد

یہودیوں کا علم سرنگوں ہو ربِ جلیل
تمام ملتِ مسلم پہ آئے رنگِ خلیلؑ

جہاں میں چرچا ہو اسلام کی ضیاؤں کا
مرے خدا رہے سایہ تری عطاؤں کا

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

تم لوٹ جاؤ (نثری نظم)

لوٹ جاؤ کہ صدیوں
کی مسافتیں اوڑھے
مسافر گمان کے سفر میں ہے
چاروں اور گرد سفر
کی دبیز چادر تنی ہے
اور ماہ و سال غلام گردشوں میں
دُھندلا چکے ہیں
لوٹ جاؤ کہ دہائیوں سے
وفاؤں کی
کسوٹی پر پرکھے جانے والے لوگ
روایتوں کے انگاروں پر چلنے والے لوگ
عہد و پیمان میں جکڑے ہوئے لوگ
میرے تعاقب میں ہیں
لوٹ جاؤ کہ معلوم ہوا ہے
کہ سہانے خوابوں کی تعبیریں
تلخ حقیقتوں کی اُڑتی راکھ میں
تحلیل ہو چکی ہیں

لوٹ جاؤ
کہ کوئی تہی دست
کچھ سمے کے لیے
کسی کی دسترس میں
ہو بھی تو کیا حاصل؟
کہ تہی دست تو اپنی دسترس میں بھی نہیں ہوتا

طلعت شبیر

موت کی خوشی

ڈھونڈ لیتی ہے
موت
سات پردوں میں چھپے
جوہر کے نقطے کو
چلی جاتی ہے
نامعلوم مسافتوں کی پُراسراریت میں
جہاں ہر فرد کے عقیدے کی راکھ جُداگانہ ہے
بے بسی کی تاریخ سے
صرف آنسو۔۔۔۔خالص ملے ہیں
لیکن اُن میں بھی خودغرضی کا نمک چھپا ہے
محض دل ہے
جہاں یاد کی حکمرانی کی سلطنت آباد ہے
عروج وزوال کے کڑوے
میٹھے بادام ہیں
دائم آباد کی شاموں کا عکس
آخرکار
صبر کی چیونگم سے چبا کر
دنیا کے سمندر میں پھینکنا ہی پڑتا ہے
وقت
دُکھ بانٹنے میں مصروف
نئے واقعات کی تزئین وآرائش میں مشغول ہے
البتہ کچھ دُکھوں کا مداوا موت بھی نہیں کرسکتی
ہمارے سامنے
ہجر کے سکوت کا پرندہ ہے
وجود کے شجر پر بیٹھا
غیرمنقوط لفظوں سے
غم کی تبلیغ کررہا ہے
مگر ہم بے سدھ
غنودگی کی راہ پہ چلتے ہوئے
اپنے حصے کے خواب دفن کررہے ہیں
خود کو مٹی ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں

امجد بابر

نثری نظم

کبھی کسی نے کہا تھا
بہت زیادہ جذباتی وابستگی بھی اچھی نہیں ہوتی
رشتوں میں اعتدال نہ رہے تو اداسیاں دل میں
گھر کر لیتی ہیں
پھر لاکھ ان سے دامن چھڑانا چاہو
دل سے رخصت نہیں ہوتیں
مجھے اداس چہرے بھاتے ہیں
بھیگی آنکھوں کے خواب میری روح کو اشانت رکھتے ہیں
دکھ سے وابستگی اتنی ہی گہری ہے جتنی تم سے چاہت
ہم ہمیشہ کسی نہ کسی ناتے سے ایک دوسرے سے وابستہ رہے ہیں
کبھی ایک دوسرے کو رد کرنے کی خواہش میں
اور کبھی ایک دوسرے کو فتح کرنے کی آرزو میں
فاصلے بڑھا دینے سے دوریاں نہیں بڑھتیں
ہم میلوں کی دوری پر بھی ایک دوسرے کو محسوس کر سکتے ہیں
وابستگی کسی بیان کی محتاج نہیں
جذبے بن کہے بھی بیاں ہوتے ہیں
خامشی لاکھ رشتوں میں حائل رہے
کچھ باتیں بن کہے سمجھ آتی ہیں

نائلہ راٹھور

رائیگانی

لوگوں کے رویّے سے
دل کُڑھتا رہتا ہے
وہم و گماں میں بھی نہیں ہوتا
کوئی کچھ ایسا کہ جاتا ہے
کانٹا سا حلق میں پھنسا رہتا ہے
کوئی کچھ ایسا کر جاتا ہے
خمیازہ بھرتے بھرتے
عمر تلف ہو جاتی ہے
اپنے پرائے سب اِک جیسے ہیں
کوئی کسی کا نہیں
کس کا گلہ، کس سے شکوہ کیا جائے
اخلاص نہیں ہے کسی میں ذرا سا
احساس نہیں ہے کسی کو کسی کا
ایسے بے حس لوگوں میں
جینا بھی کوئی جینا ہے
زہر پیالہ پینا ہے

امر مہکی

ڈوبتی اُبھرتی شام

کِس قدر ہراساں ہے
آسماں کے ساحل پر
آ کے یہ ٹھہرتی شام

عُمر بھر اُٹھایا ہے
جوگ آرزوؤں کا
اور اِک سِسکتی شام

آنکھ روزنوں پہ ہے
کِس طرح گزاروں گی
راکھ سی سُلگتی شام

رات بھر مناتی ہے
سوگ اِن اندھیروں کا
خواب سے نِکلتی شام

چاند جام بھر لایا
کِس کی ہم نشینی میں
ڈوبتی اُبھرتی شام

عظمیٰ نقوی

نظم

ہمیں تو خواب ہونا تھا
کہیں اک راز ہونا تھا
محبت کی کہانی میں
کسی کی یاد ہونا تھا
برس تھا بھوروں سا
چھپی اک بات ہونا تھا
جو لاحاصل کی تمنا میں
یونہی بے نام ہونا تھا
جدا رستوں پہ چلنا تھا
سنہری شام ہونا تھا
وصل ہجر کہنے میں
بہت بے باک ہونا تھا
وفا کی لاج رکھنا تھی
ذرا سا خاص ہونا تھا
ہمیں تو خواب ہونا تھا
ہمیں بس خواب ہونا تھا

شائستہ رمضان

اداکار

ابھی اس زمیں پر ہمارے لیے کوئی کردار لکھا گیا ہے

نہ کوئی ضمانت

ابھی وادیٔ خاک کے ایک گوشے میں ہم

اک ڈرامے کے منظر سجانے کی خاطر

مٹر گشت پر ہیں

ہمیں حکم ہے

ہر گھڑی ایک کردار کو باوفا دلربا جاں پناہ

اور بہت کچھ بنانے کی خاطر

کسی نیم جاں بے وفا اور لاچار بندے کا کردار کرتے رہیں

اور بڑے رول کرنے کی حسرت لیے

خاک کا سائبان اوڑھ لیں

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گھٹتے گھٹتے میں کتاب عشق میں
ایک سطر انتسابی ہو گیا

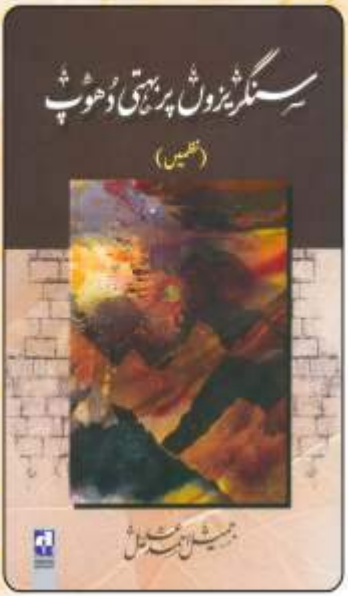

سنگریزوں پر بہتی دھوپ
(نظمیں)

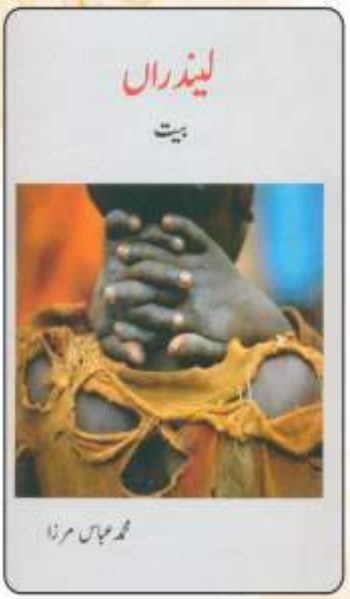

لینڈراں
محمد عباس مرزا

نمازِ محبت ادا ہم کریں گے
(اردو غزلیں)
وفا کے شجر کو ہرا ہم کریں گے
نماز محبت ادا ہم کریں گے

جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محترمہ نیلم احمد بشیر، جناب عمران منظور (یاض ایوارڈ تقریب)

جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب امجد اسلام، جناب اعجاز رضوی

جناب نجیب احمد، محترمہ ناہید قاسمی، جناب امجد اسلام امجد، جناب عمران منظور
جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا